دو سال بعد



شرت چندر چیٹرجی کے قلم سے

Mrs. Raj Rani Nanda

دو سال بعد

و

دیگر کہانیاں

مصنفہ
شرت چندر چیٹرجی

مترجمہ
بی۔ ایس دلشاد نشکلنک
بی۔ ایس۔ سی (امریکہ)

پبلشرز
بھگت مکند لال دھرمارتھ ٹرسٹ امرتسر

تعداد ایک ہزار　　دوسری بار　　قیمت ۱/۸

فہرست مضامین

میں

جناب کرم چند صاحب تینجہ بی۔ اے کا تہِ دل سے

شکر گذار ہوں۔ جنہوں نے ہندی الفاظ کو اُردو

کا لباس پہنانے میں میری خاص طور پر مدد کی ہے*

دل شاد

انتساب

یہ ناچیز تحفہ میں اپنے عزیز دوست
بھائی تارا سنگھ فخر مرحوم کے
نام نامی سے ممنون کرتا ہوں ۔

دلشاد

کون ہے؟

جو ادبی دُنیا میں شرت چندر کے نام سے واقف نہیں
آپ بلند پایہ بنگالی ادیب ہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی میں ادب پر جس قدر کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں "برائے زندگی" کے اصول کو پیش نظر رکھا۔ شرت سہائت موصوف کا بہترین اعلیٰ شاہکار ہے۔ جس میں "ادب برائے زندگی" کے اصول پر انسانی زندگی کو نہایت ہی دردناک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔"

رفیق محترم "دلشاد نشکنگ" لئے شرت سہائیت کا اردو ترجمہ کچھ اس انداز سے کیا ہے۔ کہ ہر لفظ اور ہر فقرے میں نہ صرف اصل کتاب کی رنگت ہی پائی جاتی ہے۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی رُوح نمایاں طور پہ بول رہی ہے۔

سچ تو یہ ہے۔ کہ دلشاد نے "دو سال بعد" کے نام سے اردو ترجمہ کر کے شہرت سہائیت پر چار چاند لگا دئے ہیں یہ کتاب گویا "ادب برائے زندگی" کی منہ بولتی تصویر ہے۔"

نیاز مند
محمد سعید نقشبندی پرنسپل دار العلوم
السنہ شرقیہ۔ امرتسر

دیباچہ

جہاں ہندوستان کی فضا اپنے اندر خوش گوار موسم رکھتی ہے۔ ہندوستان کی ندیاں اپنے سینے میں سونے کے ذخیرے رکھنے کے باعث مشہور ہیں۔ اور کوہ ہیروں سے بھرے پڑے ہیں۔ وہاں ہندوستان کی مٹی میں بھی یہ وصف ہے۔ کہ وہ ہر دور میں کوئی نہ کوئی ایسی شخصیت پیدا کرے۔ جسے عالمگیر شہرت نصیب ہو۔

اس ملک کا صوبہ بنگال بڑے انسان پیدا کرنے میں تو خاص طور پر مشہور ہے۔ بین الاقوامی حیثیت رکھنے والے لوگ اور غیر فانی شخصیت قائم کرنے والے ہندوستانی اکثر و بیشتر اسی صوبہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ فنون لطیفہ کا یہ مرکز ہے۔ ادب اور آرٹ کا گہوارہ کہنا چاہئے۔ اسے راگ اور شعر کا مسکن کہا جا سکتا ہے۔ غرضیکہ ہر لحاظ سے یہ ہندوستانیوں کے لئے فخر کا مقام ہے۔

مرحوم شرت چندر چیٹر جی بھی اسی صوبہ میں پیدا ہوئے۔ جنہوں نے کہ ہندوستانی ادب کی سنہری مثالیں قائم کیں۔ اور جو نثر میں طرح نو کے موجد کہے جاتے ہیں۔ شرت بابو نے صرف اپنے وطن مالوف کی سنہری روایات کو بحال کیا۔ بلکہ ادب کے نئے معیار کو پیدا کیا۔ جس پر اس ملک کے انسان ہمیشہ فخر کرتے رہیں گے آپ نے عالم اوہام میں سستی فکر کی قدیم علت کو ختم کرتے ہوئے اس بات کو ترجیح دی۔ کہ زندگی کے ٹھوس حقائق پر لکھا جاوے۔ اور بجائے

طلسماتی کہانیوں کے عام انسانوں کی زندگی کو پیش کیا جاوے۔ آپ کی ہر تصنیف۔ ایک عام قسم کے معمولی انسان کی لغزشوں اور عقیدت مندانہ اقدامات کو پیش کرتی ہے اور اس خوبی کے ساتھ کہ پڑھنے والا ماحول میں گم ہو کر رہ جائے اور خود کو کہانی کا کردار سمجھنے لگ جائے۔ یہ شرت بابو کے اسلوب بیان کا نتیجہ ہے۔ کہ اُن کی ہر کہانی واقع بن کر رہ جاتی ہے۔ یہ ان کی سادگی انداز ہے کہ ہر واقع ماحول کا حصہ معلوم ہوتا ہے اُن کی کہانیوں کے کردار۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہم میں سے ہیں۔ ہمارے ہی قریب ہیں اُن کی لغزش ہماری کمزوری ہے۔ اُن کی خوبی۔ ہمارا فخر ہے اس سے زیادہ کسی مصنف سے بس معجزہ ہی کی توقع کی جاتی ہے۔ ورنہ شرت بابو اُس رفعت پہ پہنچ کر ہی رہے۔ جس کا اندازہ اُن سے پہلے کے لوگوں کے محض تخیل میں تھا۔

زیر نظر کتاب "دو سال بعد" ان کی چند کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جو نہایت حسین موضوعات پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے ہر کہانی جاذب توجہ اور انتہائی حد تک دلچسپ ہے، اور اپنے میں یہ وصف رکھتی ہے کہ ایک بار پڑھنے والا۔ اُسے بار بار پڑھنے پر مجبور ہو جائے اور ہر بار یہ خواہش کرے۔ کہ کاش! وہ اس ماحول میں شامل ہوتا۔ کاش وہ خود ایک کردار ہوتا۔

میرے دوست مسٹر دلشاد نشکلنک نے یہ مجموعہ اپنے حسن بیان سے نہایت کامیابی کے ساتھ اردو زبان کے پیراہن میں پیش کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اس کامیابی پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ انہوں نے مصنف کے جذبات کی رُوح کو نہایت لطافت سے برقرار رکھتے ہوئے کہانیوں کو اُن کے مستحق معیار پر پیش کیا ہے۔

رام مورتی طائر

بندو کا للاّ

یادو مکرجی اور مادھو مکرجی سگے بھائی نہیں ہیں۔ اسے وہ خود تو بھول ہی گئے تھے۔ باہر کے لوگ بھی بھول گئے تھے۔ غریب یادو نے کتنی ہی تکلیفیں سہہ کر اپنے چھوٹے بھائی مادھو کو قانون کا امتحان پاس کرایا تھا اور بڑی کوشش کے بعد دولتمند زمیندار کی اکلوتی بیٹی بندو باسنی کو بھائی کی دولہن کی شکل میں اپنے گھر لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ بندو باسنی غیر معمولی حسین و جمیل تھی۔ پہلے پہل جس روز وہ اپنا بے نظیر حسن و جمال اور دس ہزار روپے کے پرومیسری نوٹ لے کر اس گھر میں آئی اس روز بڑی بہو اپورنا کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے تھے۔ گھر میں ساس نند کوئی نہ تھی وہ ہی گھر کی مالکن تھیں چھوٹی بہو کا مکھڑا اوپر اٹھا کر اس روز انہوں نے اپنی پڑوسنوں کے سامنے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا، گھر میں بہو لائی جائے تو ایسی بالکل لکشمی کی مورت" مگر دو ہی دن میں انہیں اپنی غلطی کا علم ہو گیا۔ دو ہی روز میں پتہ چل گیا۔ کہ چھوٹی بہو جس ناپ تول سے حسن اور دولت لائی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ غرور اور شان بھی ساتھ لیتی آئی ہے۔

ایک روز بڑی بہو نے اپنے شوہر کو تنہائی میں بلا کر کہا "کیوں جی! روپ روپیوں کی گٹھری ہی دیکھ کر بہو لائے ہو! یہ تو کالی ناگن ہے!
یادو کو اس بات پر یقین نہ ہوا۔ وہ سر کھجاتے ہوئے دو چار بار "وہ تو.... وہ تو...." کہہ کر کچہری چلے گئے۔ یادو نہایت نرم اور سنجیدہ

طبیعت آدمی ہیں، وہ زمیندار کے یہاں نائب (کارندہ) کا کام کرتے تھے اور گھر آکر پوجا پاٹ میں لگ جایا کرتے تھے۔ مادھوا اپنے بڑے بھائی یادو سے دس سال چھوٹا تھا۔ وکیل ہو کر حال ہی میں اس نے اپنا روزگار شروع کیا تھا۔ اس نے بھی آ کر کہا "بھابھی، بھیا کے لئے روپیہ ہی کیوں بڑی چیز ہو گیا؟ ٹھہر جاتے تو میں بھی تو روزگار کر کے لا سکتا تھا"۔ اپنو رنا خاموش رہی۔

اس کے سوا ایک اور آفت بھی تھی۔ وہ یہ کہ چھوٹی بہو پر حکومت کرنا آسان نہ تھا۔ اسے ایسی خوفناک "فِٹ" کی بیماری تھی۔ کہ دورہ ہونے پر اس کی طرف دیکھتے ہی سارے گھر کا سر چکرا جاتا۔ اور ڈاکٹر کو بغیر بلائے کوئی چارہ ہی نہ رہتا۔ لہذا یہی خیال سب کے دماغ میں جڑ پکڑ گیا۔ کہ ایسے شوق کی شادی میں بڑی غلطی ہو گئی ہے، صرف یادو نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ سب کے خلاف کھڑے ہو کر برابر کہتے رہے "نہیں جی نہیں۔ تم لوگ بعد میں دیکھنا میری بہو رانی کا جگدھاتری سا روپ ہے۔ کیا وہ بالکل ہی بے نتیجہ ہوگا! ایسا ہو نہیں سکتا"۔

ایک روز دیکھا کوئی ایک بات ہو جانے پر چھوٹی بہو منہ ادا اس کئے چپ بیٹھی ہوئی ہے۔ ڈر کے مارے اپنورنا کے ہوش اڑ گئے۔ اچانک اسے نہ جانے کیا سوجھا۔ کہ وہ کمرے میں دوڑی چلی گئی اور اپنے ڈیڑھ سال کے سوتے ہوئے بچے امول چرن کو اٹھا لا کر بندو کی گود میں ڈال کر چلی گئی۔

امول کچی نیند میں جاگ جانے کے سبب زور زور سے رونے لگا۔ بندو جی جان سے اپنے کو سنبھال کر اور بیہوشی کے پنجے سے اپنی حفاظت کر کے بچے کو چھاتی سے لگائے کمرے میں چلی گئی۔ اپنورنا اوٹ میں چھپی ہوئی یہ دیکھتی رہی اور فٹ کی اس دوائے خاص کی ایجاد کر کے خوش ہو اٹھی۔

گھر گرہستی کا سارا بار انپُورنا ہی کے سر پر تھا۔ اس لئے وہ بچے کی ٹھیک سے نگہداشت نہ کر سکتی تھی۔ خصوصاً دن بھر کام کرنے کے بعد وہ رات کو سونے نہ پاتی۔ تو اس کی طبیعت خراب ہو جایا کرتی۔ اس لئے بچے کی دیکھ بھال کی ساری ذمہ واری چھوٹی بہو نے اپنے سر لے لی۔

تقریباً مہینے بھر بعد ایک روز سویرے بندو بچےؐ کو گود میں لئے رسوئی گھر میں گئی۔ اور بولی "جیجی! امول دھن کا دُودھ کہاں ہے؟"

انپُورنا نے فوراً ہاتھ کا کام چھوڑ کر ڈرتے ہوئے کہا۔ ایک منٹ ٹھہر جا بہن، ابھی گرم کئے دیتی ہوں۔"

بندو رسوئی گھر میں گھستے ہی دُودھ کو کچا رکھا ہوا دیکھ کر برہم ہو گئی تھی۔ اس نے ترش لہجے میں کہا: "کل بھی تم سے کہا تھا کہ مجھے آٹھ بجے سے پہلے ہی دودھ چاہئے۔ مگر اب نو بج رہے ہیں۔ اگر اتنا کام بھی تمہیں زیادہ ہوتا ہے۔ تو صاف کیوں نہیں کہتیں، میں دوسرا راستہ دیکھوں۔

اور کیوں مصرانی جی! تمہیں بھی اتنا ہوش نہیں رہا گھر بھر کے لئے جو پکایا جا رہا ہے۔ وہ دو منٹ بعد ہی پک جاتا۔

مصرانی چپ ہی رہی۔

انپُورنا نے کہا: "تیری طرح لڑکے کو صرف کاجل لگانے اور ٹیکہ دینے کا کام ہوتا تو ہم لوگوں کو بھی ہوش رہتا۔ ایک منٹ کی دیر بھی اب نہیں برداشت ہوتی۔ چھوٹی بہو!

چھوٹی بہو نے اس کے جواب میں کہا: "تمہیں بہت بڑی سوگند رہی اگر پھر کسی روز تم نے للاّ کے دُودھ میں ہاتھ لگایا اور مجھے بھی قسم ہے اگر میں نے پھر کسی دن تم سے کہا۔"

یہ کہہ کر اس نے دھم سے بچّے کو زمین پر بٹھا دیا۔ اور دُودھ کی کڑاہی اُٹھا کر چُولھے پر چڑھا دی۔ اس غیر متوقع صورتِ حال کے سبب امول زور سے رونے لگا۔ اور اس کا رونا تھا۔ کہ بندو نے اس کے گال مسل کر ڈانٹا "چُپ رہ بدمعاش چُپ رہ۔ چلّایا تو اکدم مار ہی ڈالوں گی"

بندو کی اس کرتوت سے گھر کی مہری وہاں دوڑی آئی اور بچّے کو گود میں اُٹھانا ہی چاہتی تھی۔ کہ بندو نے اسے ڈانٹ دیا "دور ہو سامنے سے دور ہو جا" پھر وہ آگے نہ بڑھ سکی۔ ڈر کے مارے سٹپٹا کر رہ گئی۔

بندو نے پھر کسی سے کچھ نہ کہا اور روتے ہوئے بچّے کو گود میں لے کر دُودھ گرم کرنے لگی"

انپورنا ساکت سی کھڑی رہی۔ کچھ دیر بعد جب بندو دُودھ لے کر چلی گئی تو اس نے مصرانی کو مخاطب کر کے کہا "سُن لی مصرانی! اس کی بات! اس روز میں نے ہنسی ہنسی میں کہہ دیا تھا نہ، امول کو تو لے لے، چھوٹی بہو اسی کے زور پر آج مجھے بھی سوگند دے گئی"

کچھ بھی ہو انپورنا کا لڑکا بندو باسنی کی گود میں جس طرح کھانے پینے اور بڑا ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ امول چاچی کو "ماں" اور ماں کو "جیجی" کہنا سیکھ گیا"

× × × × × × × × ×

(۲)

اس کے کوئی چار سال بعد جب خوب دھوم کے ساتھ اموُل کر پڑھنے بٹھایا گیا۔ اس کے دوسرے روز صبح انپورنا رسوئی کے کام میں مشغول تھی، اتنے میں باہر سے بندو باسنی نے پکار کر کہا ”جیجی۔ اموُل دھن پاؤں چھونے آیا ہے، ذرا باہر تو آؤ“

انپورنا نے باہر آکر اموُل کی ٹھاٹ دیکھی تو دنگ رہ گئی۔ لڑکے کی آنکھوں میں کاجل پیشانی پر ٹیکہ، گلے میں سونے کی زنجیر سر پر چوٹی بندھے ہوئے بال، زرد رنگ کی چھپی ہوئی دھوتی، ایک ہاتھ میں سُتلی سے بندھی ہوئی مٹی کی دوات اور بغل میں چھوٹی سی ایک چٹائی میں لپٹے ہوئے تھوڑے سے تاڑ کے پتے“

بندو نے کہا ”جیجی کے پاؤں چھوکر پا لگی تو کرو بیٹا“

اموُل نے اپنی ماں کو پرنام کیا۔

اس کے پیروں میں نہ جُوتے تھے نہ موزے، نہ طرح طرح کی ولائتی پوشاک انپورنا نے اس خوبصورت لباس کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا ”تجھے اتنا آتا ہے چھوٹی بہو۔ لڑکا شاید پڑھنے جا رہا ہے!“

بندو نے ہنستے ہوئے کہا ”ہاں، گنگا پنڈت کی پاٹھ شالہ میں بھجوا رہی ہوں، آشیر باد دو جیجی۔ آج کا دن اس کی زندگی میں مبارک ہو“

پھر نوکر کی طرف مڑکر کہا ”بھیر وا پنڈت جی سے میرا نام لے کر خاص طور سے کہہ دینا، میرے للّا کو کوئی مارے پیٹے نہ، اور جیجی یہ پانچ روپے لو۔ خوب اچھی طرح سیدھا (دال چاول وغیرہ) سجا کر اس میں یہ پانچ روپے رکھ کر کدم کے

ہاتھ پنڈت جی کے پاس بھجوا دو۔" کہتے ہوئے اس نے فرطِ محبّت سے للاؔ کے رُخسار چوم لئے۔ اور اسے گود میں لے کر چل دی۔

انپورنا کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اُسنے مصرانی سے کہا:" للاؔ ہی سے فرصت نہیں۔ مصروف رہتی ہے۔ وہ بھی پیٹ میں نہیں رکھا۔ نہیں تو نہ جانے کیا کرتی۔"

مصرانی نے کہا:" شائد اسی سے بھگوان نے نہیں دیا۔ اٹھارہ اُنیس سال کی ہو چکی۔"

بات پُوری نہ ہو سکی۔ چھوٹی بہو بچے کو چھوڑ کر اکیلی لوٹ آئی۔ بولی:" جیجی۔ جیٹھ جی سے کہہ کے کیا اپنے مکان کے سامنے ایک پاٹھ شالہ نہیں کھلوائی جا سکتی؟ میں سب کا خرچ دوں گی۔"

انپُورنا ہنس دی۔ بولی۔" ابھی دو قدم بھی تو نہیں گیا چھوٹی بہو۔ اتنے ہی میں تیری طبیعت بدل گئی۔ نہ ہو تو تو بھی جانا، پاٹھ شالہ میں جا کر بیٹھی رہنا۔"

بندو شرما سی گئی ہنس کر بولی۔" طبیعت نہیں بدلی جیجی، مگر سوچتی ہوں آنکھوں سے اوجھل رہنا ایک بات ہے اور آنکھوں کے سامنے رہنا دوسری بات ہے، ساتھ پڑھنے والے لڑکے سب ٹھیرے شرارتی، اس کو چھوٹا سمجھ کر اگر ماریں پیٹیں؟

انپُورنا نے کہا:" اس سے کیا۔ لڑکے مارپیٹ تو کیا ہی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ لڑکے تو سبھی کے یکساں ہیں چھوٹی بہو۔ ان کے ماں باپ اگر دل کو سخت کر کے پاٹھ شالہ بھیج سکتے ہیں تو تُو کیوں نہیں بھیج سکتی؟"

دوسروں کے ساتھ مقابلہ کرنا بندو کو قطعی پسند نہ تھا۔ شائد اس

سے وہ دل ہی دل میں بگڑ کر بولی۔ "تمہاری بات ہی ایسی ہوتی ہے جیجی۔ مان لو کوئی اس کی آنکھوں میں قلم ہی بھونک دے۔ تو؟"

انپورنا اس کے دل کا اندازہ کر کے ہنس دی۔ بولی: "تو پھر ڈاکٹر کو دکھاتا مگر سچ کہتی ہوں تجھ سے، میں تو سات دن سات رات بیٹھ کر سوچتی۔ تب بھی یہ آنکھوں میں قلم بھونکنے کی بات میرے دماغ میں نہ آتی۔ اتنے لڑکے پڑھتے ہیں میں نے تو نہیں سُنا کہ کوئی کس کی آنکھ میں قلم بھونکتا رہتا ہے۔"

بندو نے کہا: "تم نے نہیں سُنا تو کیا ایسی بات ہو ہی نہیں سکتی؟ ہونی کی بات کون کہہ سکتا ہے؟ اچھی بات ہے، تم ایک بار کہہ کے دیکھو تو سہی اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

انپورنا نے سنجیدگی سے کہا: "جو ہوگا وہ تو صاف ہی دکھائی دیتا ہے تو نے جب ٹھان لی ہے تو کیا بغیر پورا کئے چھوڑے گی؟ لیکن میں ایسی دنیا بھر سے الٹی بات اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔ اور تو بھی تو بولتی ہے ان سے، خود ہی کہنا نہ۔"

اب تو بندو کو غصہ آگیا بولی: "کیوں گی ہی۔ میں اتنی دور روز روز اپنے للا کو نہیں بھیج سکتی، چاہے کسی کو بُرا لگے یا بھلا۔ اور چاہے اس کو پڑھنا آئے یا نہ آئے۔" کیوں ادی کدم، تجھ سے کہا تھا نہ سیدھا دے آنے کو؟ منہ پھاڑے کھڑی کیا دیکھ رہی ہے؟"

اس کے غصے کا اندازہ دیکھ کر انپورنا پریشان ہو کر بولیں: "سیدھا دے رہی ہوں، اکدم دیوانی نہ ہو جا چھوٹی بہو، اچھا کیا تیرا للا کبھی بڑا نہ ہوگا؟ کیا ہمیشہ تو اسے آنچل سے ڈھک کر رکھ سکے گی؟ اس بات کو کیوں نہیں سوچتی؟"

چھوٹی بہو نے اس بات کا جواب دیئے بغیر کہا: "کدم، سیدھا دے کر

پنڈت جی کے پاؤں کی دھول ذرا للا کے سر سے لگا کر اسے اپنے ساتھ لوٹا لانا اور پنڈت جی سے بھی ذرا شام کے وقت آنے کے لئے کہتی آنا۔ جو سمجھنا ہی نہ چاہیں ان کو کیسے سمجھایا جائے۔ میں کہتی ہوں اگر چھوٹا دیکھ کر کوئی اسے مار پیٹ دے تو؟ — وہ کہتی ہیں۔ کیا تو ہمیشہ آنچل سے ڈھک کر رکھ سکتی ہے؟ — کیا کر سکتی ہوں اور کیا نہیں یہ صلاح لینے تو میں آئی نہیں تھی" کہہ کر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر ہی چلی گئی۔ انپورنا حیران سی اپنی جگہ کھڑی رہی۔

کدم نے کہا "اب کھڑی مت رہو، بہو جی ابھی پھر چلی آئیں تو بس انہوں نے جب دل میں ایک بات ٹھان لی ہے تو پھر بڑھاتا ہی کیوں نہ آجائیں۔ وہ رد تھوڑے ہی ہو سکتی ہے"

اسی روز شام کو بڑے بابو افیم کھا کر بستر پر لیٹے حقہ کی نے منہ سے لگائے نشے کی پشت پر چابک رسید کر رہے تھے۔ اتنے میں دروازے کی زنجیر بج اٹھی۔

یادو نے بمشکل آنکھیں کھول کر کہا۔ کون ہے؟
انپورنا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ چھوٹی بہو کچھ کہنے آئی ہے سن لو"

یادو نے پریشان ہو کر پوچھا چھوٹی بہو؟ کیوں بہو، کیا ہے؟"
چھوٹی بہو کو وہ بہت مانتے تھے۔ چھوٹی بہو کچھ نہ بولی۔ اس کی بجائے انپورنا نے کہہ دیا" اس نے للا کی آنکھ میں پاٹھ شالہ کے لڑکے کہیں قلم نہ چبھو نک دیں۔ اس لئے مکان ہی میں ایک پاٹھ شالہ کھلوانا چاہتی ہے"

یادو نے حقّے کی نے کو پھینک کر گھبرا کر پوچھا "این کس نے آنکھ میں مار دیا؟ کہاں ہے۔ دیکھوں"
انپورنا نے ان کے ہاتھ میں نے دیتے ہوئے ہنس کر کہا۔ ابھی کسی نے مارا نہیں "آنکھ مارے" کی بات ہو رہی ہے"
یادو نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا "اچھا! آنکھ کوئی مارے کی بات ہے، اب میں سمجھا۔ شائد۔ ۔ ۔ ۔"
بند کواڑ کی اوٹ میں کھڑی کھڑی جل بھن کر خاک ہو گئی۔ اس نے آہستہ آواز میں کہا "جیجی اس وقت تو تم نے کہا تھا کہ ایسی دنیا سے الٹی بات میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔ اب کیوں کہنے آ گئی ہو؟"
خود انپورنا بھی سمجھ گئی تھی۔ کہ اس کے کہنے کا ڈھنگ اچھا نہیں تھا اور اس کا نتیجہ بھی خوشگوار نہ ہوگا۔ اب اس آہستہ آواز کے پیچیدہ مطلب کو واضح طور پر دل نشین کر کے وہ سچ مچ ڈر گئی۔ اس کا غصّہ جا پڑا بیچارے بے قصور شوہر پر انہیں کو مخاطب کر کے اس نے کہا "افیم کے نشے سے آدمی کی آنکھ تو مینچ ہی جاتی ہے۔ کیا کان بھی بند ہو جاتے ہیں، میں نے کیا کہا تھا۔ اور تم نے کیا سنا۔ کہاں ہے دیکھوں؟ میں نے کیا تم سے یہ کہا تھا۔ کہ للّا کی آنکھ پھوڑ دی گئی ہے؟ میری جان تو سب طرف سے آفت میں ہے"
ہر طرف کے اختلاف سے دور رہنے والے یادو کی افیم کی پینک ٹوٹنے کی نوبت آ پہنچی۔ انہوں نے ہکّا بکّا ہو کر پوچھا۔ کیوں کیا ہوا بھئی؟"
انپورنا نے غصّہ میں کہا "جو ہوا وہ بھی اچھا ہی ہوا۔ ایسے آدمی سے بات کرنا ہی جھک مارنا ہے۔ میری قسمت ہی کا پھیر ہے" کہتی ہوئی وہ کمرے

سے باہر نکل گئی۔

یادَو نے کہا "کیا ہُوا ہے بہُو رانی۔ ذرا صاف صاف بتاؤ تو؟"

بندو نے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر آہستہ سے کہا "باہر کھسور کے پاس ایک پاٹھ شالہ ہو جاتی تو . . . . "

یادَو نے کہا۔ یہ کون سی بڑی بات ہے بہُو رانی۔ لیکن اس میں پڑھائے گا کون؟"

بندو نے کہا "پنڈت جی آئے تھے۔ انہیں مہینے میں دس روپے مل جایا کریں تو وہ اپنی پاٹھ شالہ وہاں سے اُٹھا لائیں گے۔ مَیں کہتی ہُوں کہ میرے سُود کے جمع شدہ روپیوں سے یہ سب خرچ دیا جائے۔"

یادَو نے مطمئن ہو کر کہا "اچھی بات ہے میں کل ہی آدمی لگا دوں گا۔ اگر گنگا رام اپنی پاٹھ شالہ یہیں لے آئیں تو اچھی ہی بات ہے۔

جیٹھ جی کا حکم پا جانے سے بندو کا غصّہ کچھ کم ہو گیا۔ اس نے بشاش متبسّم چہرے سے رسوئی گھر میں جا کر دیکھا۔ انپورنا منہ پھُلائے بیٹھی تھی اور اسی کے پاس کدم ہاتھ اور سر کو جنبش دیتی ہوئی کچھ گفتگو کر رہی تھی، بندو کو آتے دیکھ کر اس نے اری میّا یہ تو . . . . " کہہ کر اپنی تقریر ختم کر دی، بندو سمجھ گئی۔ اس کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اس نے سامنے آ کر کہا "اری میّا کیا کہتی کیوں نہیں؟

ڈر کے مارے کدم کی زبان لڑکھڑا گئی۔ اس نے گھونٹ سا بھر کر کہا۔ نہیں جیجی یہ سمجھو کہ بڑی بہو جی نے کہا تھا نہ۔ وہی میں نے کہا۔ کیا نام . . . . " بندو نے خشک لہجے میں کہا ہاں کہا تھا۔ جا تو اپنا کام دیکھ چل ہٹ۔

کدم نے چوں تک نہ کی۔ وہ وہاں سے جان بچا کر بھاگی۔
پھر بندو نے اپنوُرنا سے کہا "بڑی مالکن کے صلاح کار بھی خوب ہیں! جیٹھ جی سے کہہ کے ان کی تنخواہ بڑھوا دینی چاہیئے"
بندو جب خوش ہوتی ہے تو اپنورنا کو بیجی کہتی ہے اور غصہ ہو جائے پر بڑی مالکن!
اپنوُرنا نے چڑ کر کہا "جانہ۔ کہہ آ جاکر۔ جیٹھ جی میرا سر اُتروالیں گے! اور جیٹھ جی کون سے کم ہیں! اسی وقت شروع کر دیں گے "کیا ہے بہو رانی! کیا کہتی ہو؟ ٹھیک بات ہے۔ میں نے بہتوں کی تقدیریں دیکھی ہیں چھوٹی بہو۔ مگر تیری جیسی بلند تقدیر کسی کی نہیں دیکھی۔ کیسی تقدیر لے کر پیدا ہوئی تھی گھر کے سبھی لوگ جیسے ڈر سے سہمے رہتے ہیں!"
بندو کو غصہ تو آیا تھا۔ مگر اپنوُرنا کی بات کرنے کا انداز دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی۔ بولی "کہاں، تم تو نہیں ڈرتیں!"
اپنوُرنا نے کہا "میں نہیں ڈرتی! تیری خوفناک صورت دیکھ کر جس کی چھاتی کا خون پانی نہ ہو جائے، ہے کوئی ایسا ماں کا لال! مگر اتنا غصہ اچھا نہیں چھوٹی بہو۔ کیا ابھی تک تو ننھی ہی ہے! بچے ہوئے ہوتے تو اب تک تو چار پانچ بچوں کی ماں بن چکی ہوتی۔ اور میں صرف تجھی کو کیوں قصوروار ٹھہراؤں۔ اس بوڑھے کھوسٹ ہی نے لاڈ پیار کر کے تیرا دماغ آسمان پر چڑھا دیا ہے۔
بندو نے کہا "تمہاری یہ بات تو میں مانتی ہوں بیجی۔ کہ میں اچھی تقدیر لے کر پیدا ہوئی ہوں۔ دھن دولت لاڈ پیار بہتوں کو ملا کرتا ہے۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن دیوتا کی طرح ایسے جیٹھ پانے کے لئے بہت جنموں کی

تپسیا چاہیئے۔ تب ایسا ثمرہ ملتا ہے۔ میری قسمت ہی اچھی ہے۔ جیجی تم رشک کرکے کیا کروگی؟ مگر لاڈ پیار کرکے انہوں نے میرا دماغ آسمان پر نہیں چڑھایا۔ لاڈ پیار کرکے اگر کسی نے میرے دماغ کو آسمان پر چڑھایا ہے تو وہ تمہیں ہو۔"

انپورنا نے ہاتھ مٹکا کر کہا۔ "میں نے! کوئی کہہ تو دے بھلا! میری حکومت بہت سخت حکومت ہے۔ مگر کیا کروں میری تقدیر ہی کھوٹی ہے۔ کوئی میرا رعب ہی نہیں مانتا۔ نوکر نوکرانی تک منہ کے سامنے کھڑے ہو کر برابری سے لڑنے لگتے ہیں۔ جیسے وہی مالک ہوں اور میں داسی باندی ہوں۔ اس لئے برداشت کرلیتی ہوں۔ اور کوئی ہوتی۔۔۔۔"

جیٹھانی کی ان الٹی سیدھی باتوں پر بندو کھلکھلا کر ہنس پڑی، بولی۔ جیجی! تم ست جگ کی ہو ست جگ کی۔ کیوں مرنے کے لئے اس جگ میں پیدا ہوئیں آکر۔ ہائے کہاں مجھ سے تو کوئی لڑتا جھگڑتا نہیں۔"

یہ کہہ کر یکایک انپورنا کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ اور دونوں باہیں اس کے گلے میں ڈال کر کہنے لگی۔ کوئی کہانی کہو نہ جیجی۔"

انپورنا نے غصے سے کہا۔ "چل ہٹ یہاں سے۔"

اتنے میں کدم دوڑی آئی اور بولی۔ "امول دھن نے ہاتھ کاٹ لیا ہے، سرو تب سے رو رہا ہے۔

بندو اسی وقت گلے سے باہنہ نکال کر اٹھ کھڑی ہوئی بولی۔ "سرو تب کہاں گیا؟ تم سب کی سب کیا کر رہی تھیں؟"

"میں اس کمرے میں بچھونا بچھا رہی تھی جیجی۔ معلوم بھی نہیں۔ کب بڑی بہو کے گھر میں جاکر۔۔۔۔"

"اچھا سُن لیا۔ سُن لیا۔ جا یہاں سے۔" کہتی ہوئی بندو وہاں سے چلی گئی کچھ دیر بعد للّا کی انگلی پر بھینگا کپڑا لپیٹ کر اسے گود میں لئے آئی اور بولی۔" اچھا جیجی۔ کتنے دنوں سے میں کہہ رہی ہوں تم سے۔ کہ بال بچوں کا گھر ٹھیرا۔ سروتہ اور تہ ذرا سنبھال کر کہیں اونچ پر رکھ دیا کرو۔ وہ...."

انپورنا کو اور بھی غصّہ آگیا بولی۔" تو ایسی باتیں کیا کرتی ہے چھوٹی بہو۔ جن کا نہ سر ہوتا ہے نہ پیر۔ اس ڈر سے کہ تیرا للّا گھر میں گھس کر ہاتھ کاٹ لیگا۔ کیا پہلے سے۔ سروتہ لوہے کے صندوق میں بند کر کے رکھ دیا کروں؟"

"کل سے اسے رسّی سے باندھ دیا کروں گی۔ پھر تمہارے کمرے میں گھسا کریگا۔" یہ کہتی ہوئی بندو باہر چلی گئی۔

انپورنا نے کہا۔ سن لیا ری کدم۔ اس کی زبردستی کی باتیں تو سن ذرا کیا سروتہ آدمی صندوق میں بند کر کے رکھتا ہے؟"

کدم نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ لیکن منہ پھاڑ کر رہ گئی۔

بندو لوٹ آئی۔ آکر بولی" پھر اگر تم نے کسی نوکرانی کو پنچ بنایا تو تم سے سچ کہتی ہوں۔ میں للّا کو لے کر میکے چلی جاؤں گی۔"

انپورنا نے کہا" تو چلی نہ جا۔ لیکن یاد رکھنا۔ سر ٹپک کر مر جائے گی جب بھی میں بلانے کا نام نہ لوں گی۔"

" میں آنا بھی نہیں چاہتی۔" کہہ کر بندو منہ پھلا کر چل دی۔

دو گھنٹے بعد انپورنا دھپ دھپ پیر رکھتی ہوئی چھوٹی بہو کے کمرے میں پہنچی۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک چھوٹی ٹیبل پر مادھو چندر مقدمے کے کاغذات دیکھ رہے تھے۔ اور بندو اپنے امول کو لے کر پلنگ پر پڑی آہستہ آہستہ کہانی کہہ رہی تھی۔

انپورنا نے کہا "چل کھالے"

بندو نے کہا "مجھے بھوک نہیں ہے۔"

للّا نے جھٹ سے اپنی چچی کے گلے سے چمٹ کر کہا "چھوٹی ماں نہ کھائیں گی تم جاؤ"

انپورنا نے اسے ڈانٹ دیا "تو چپ رہ۔ یہ لڑکا ہی تو سب جھگڑوں کی جڑ ہے۔ ابھی خوب لاڈ کرتی جا چھوٹی بہو، بعد میں معلوم ہوگا۔ تب روئیگی اور سر پیٹے گی۔ ہاں کہا تھا جیجی نے"

بندو نے سرگوشی سے للّا کو سکھا دیا۔ اس نے چلّا کر کہا "تم جاؤ نہ جیجی ابھی چھوٹی ماں رانی کی کہانی سُنا رہی ہے"

انپورنا نے ڈانٹ کر کہا۔ بھلا چاہتی ہے تو اُٹھ آ چھوٹی بہو۔ نہیں تو کل تم دونوں کو رخصت نہ کر دیا تو میرا نام نہیں" یہ کہہ کر جیسے آئی تھی اُسی طرح چلی گئی"

مادھو نے پوچھا۔ آج پھر تم لوگوں میں کیا ہو گیا؟"

بندو نے کہا "جیجی کے غصّہ ہونے پر جو ہوتا ہے وہی۔ آج میرا بڑا قصور ہیں قصور یہ تھا کہ ہمیں نے کہہ دیا تھا۔ ہاں بچّوں کا گھر ٹھہرا۔ سرونا وغیرہ ذرا سنبھال کر رکھا کرو۔ اس پر اتنا اودھم ہو رہا ہے"

مادھو نے کہا "اب زیادہ گڑبڑ نہ کرو۔ جاؤ۔ بھابھی جیسا دھپا دھپ چل رہی ہیں اس سے ابھی بھیا کی آنکھ کھل جائے گی"

بندو للّا کو گود میں لے کر ہنستی ہوئی رسوئی گھر کی طرف چل دی۔

x x x x x

x x x x x

(۳)

ایک ماں کے دو بچے جس طرح اپنی ماں کا سہارا لے کر بڑھتے رہتے ہیں اسی طرح ان دونوں ماؤں نے ایک ہی اولاد کے سہارے اور بھی چھ سال گذار دیئے۔

امول اب بڑا ہو چکا تھا، وہ انٹرنس اسکول کے دوسرے درجے میں پڑھتا تھا۔ گھر پر بھی ماسٹر مقرر تھے۔

صبح کا وقت تھا۔ ماسٹر پڑھا کر جا چکے تھے۔ اس کے بعد امول باہر نکلا تھا۔ آج اتوار تھا۔ اسکول میں چھٹی تھی۔

انپورنا نے گھر میں گھستے ہی کہا۔ چھوٹی بہو۔ کیا کروں بتا تو؟

بندو اپنے کمرے کے فرش پر ساری الماری انڈیل کر امول کے لئے کپڑے انتخاب کر رہی تھی آج وہ چچا کے ساتھ کسی بڑے اور معزز موکل کے گھر دعوت کھانے جانے والا تھا۔

بندو نے سر اُٹھائے بغیر ہی جواب دیا" کیا بتاؤں جیجی؟"

اس کا مزاج ذرا ناخوش تھا۔ انپورنا رنگ رنگ کی مختلف پوشاکوں کی بہار دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ اس لئے وہ اس کے چہرے کے انداز کو نہ بھانپ سکی۔ وہ کچھ دیر تک چپ چاپ دیکھتی رہی۔ پھر بولی" کیا یہ سب للا کی پوشاکیں ہیں؟"

بندو نے کہا" ہاں"

انپورنا نے کہا۔ تو کتنے روپے فضول خرچ کیا کرتی ہے۔ ان میں سے ایک کی قیمت سے غریبوں کے یہاں ایک بچے کے سال بھر کے کپڑے سلتے

بن سکتے ہیں۔"

بندو ناخوش ہوگئی۔ پھر بھی اس نے فطری انداز سے کہا۔ "ہاں بن تو سکتے ہیں۔ مگر غریبوں اور بڑے آدمیوں میں کچھ نہ کچھ فرق تو ہوگا ہی۔ اس کے لئے افسوس کرکے کیا ہوگا جیجی!"

انپورنا نے کہا۔ "سو ہوں گے بڑے آدمی۔ لیکن تیری تو تمام باتوں میں زیادتی ہوتی ہے۔"

بندو نے سر اٹھا کر کہا۔ "کیا کہنے آئی تھیں۔ کہو نہ جیجی ابھی مجھے فرصت نہیں ہے۔"

"بھلا تجھے کب فرصت رہتی ہے۔" کہہ کر جیٹھانی غصہ ہو کر چلی گئی۔

بھیرو للا کو بلانے گیا تھا۔ وہ گھنٹے بھر بعد اسے ڈھونڈھ کر لے آیا۔

بندو نے پوچھا۔ "کہاں تھا اب تک؟"

امول خاموش رہا۔

بھیرو نے کہا۔ اس محلے کے کسانوں کے لڑکے کے ساتھ گلّی ڈنڈا کھیل رہے تھے؟"

اس کھیل سے بندو کو بہت ڈر تھا۔ اس لئے اس کھیل کے لئے اس نے ممانعت کردی تھی۔ سن کر بولی۔ "گلّی ڈنڈا کھیلنے کو تجھ سے منع کردیا تھا نہ!"

امول ڈر کے مارے نیلا پڑ گیا۔ بولا۔ "میں تو کھڑا تھا۔ ان لوگوں نے زبردستی مجھے ......"

"زبردستی تجھے ......؟ اچھا ابھی تو جا۔ پھر بتاؤں گی۔" کہہ کر بندو

اسے کپڑے پہنانے لگی۔
تقریباً دو مہینے پہلے امول کی زنّار بندی ہوئی تھی۔ اس لئے اس نے منڈے ہوئے سر پر ٹوپی پہننے میں سخت اختلاف کیا۔ لیکن بندو بھلا کب چھوڑنے والی تھی۔ اس نے زبردستی پہنادی۔ منڈی چندیا پر زری دار ٹوپی پہن کر وہ رونے لگا۔
مادھو نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا "اب، اور کتنی دیر ہوگی جی؟"
دوسرے ہی لمحہ امول پر نگاہ پڑتے ہی وہ ہنس کر بولے "واہ یہ تو متھرا کے راجہ شری کرشن بن گئے ہیں"۔
امول شرم کے مارے ٹوپی پھینک کر پلنگ پر جاکر اُلٹے منہ پڑ رہا"۔
بندو غصّہ ہوگئی۔ بولی "ایک تو یوں ہی لڑکا رو رہا ہے اس پر تم نے" مادھو نے سنجیدہ بن کر کہا "روست للاّ۔ اُٹھ، لوگ پاگل کہیں گے تو مجھے کہیں گے، تو چل"۔
بالکل ایسی ہی بات اس کے پہلے ایک روز اور ہوگئی تھی۔ اور بندو اس روز بہت ہی ناراض ہوگئی تھی۔ آج پھر اس بات کی تکرار سے وہ جل بھُن کر بولی "ہاں سب کام پاگلوں سا کرتی ہوں نہ"۔ کہتی ہوئی اُٹھی۔ للاّ کو اُٹھا کر اس کے سر پر چار چھ پنکھے جما دئے۔ اور پھر قیمتی مخملی پوشاک کھینچ کھینچ کر نکال پھینکنے لگی۔
مادھو ڈر کے مارے باہر چلے گئے۔ انہوں نے جاکر بھابھی کو خبر دی "سر پر بھوت سوار ہوگیا ہے بھابھی، ذرا جاکر دیکھو نہ"۔

انپورنا نے کمرے میں جاکر دیکھا۔ بندو پہلے کی پوشاک اتار کر معمولی کپڑے پہنا رہی ہے اور للاّ ڈر کے مارے فق ہوا کھڑا ہے۔" انپورنا نے کہا" اچھی تو لگ رہی تھی۔ چھوٹی بہو، اتار کیوں دی؟"

بندو نے للاّ کو چھوڑ کر یکایک گلے میں ساری کا آنچل ڈال کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا" تم لوگوں کے پیروں پڑتی ہوں بڑی مالکن، ذرا سامنے سے ہٹ جاؤ۔ تم لوگوں کے بیچ بچاؤ کے مارے تو اس کی جان ہی نکل جائے گی!"

انپورنا بالکل خاموش کھڑی رہی۔

بندو اموں کا کان پکڑ کر اسے گھر کے ایک کونے میں کھینچ لے گئی۔ اور کھڑا کر کے بولی" تم جیسے شریر لڑکے ہو۔ ایسی ہی تمہاری سزا ہونی چاہیئے دن بھر اسی کمرے میں بند ہو جاؤ۔ جیسی آؤ باہر۔ میں دروازہ بند کروں گی" کہتے ہوئے باہر نکل کر اس نے زنجیر چڑھا دی۔

دوپہر کا تقریباً ایک بجا تھا۔ انپورنا سے نہ رہا گیا۔ وہ بولی" چھوٹی بہو۔ کیا سچ مچ تو آج للاّ کو کھانے نہ دے گی؟ کیا اس کے لئے سارا گھر فاقہ کریگا۔

بندو نے کہا" سارے گھر کی جیسی مرضی"

انپورنا بولی" یہ تیری کیسی بات ہے چھوٹی بہو، گھر میں ایک ہی تو لڑکا ہے۔ وہ فاقے سے رہے گا تو، میری تیری بات جانے دے۔ نوکر چاکر بھی کیسے کھائیں گے۔ بتا تو سہی!"

بندو نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ میں نہیں جانتی"

انپورنا سمجھ گئی بحث کرنے سے اب کوئی فائدہ نہیں بولی" میں کہہ رہی ہوں۔ بڑی بہن کی ایک بات تو رکھ۔ آج اسے معاف کر دے۔ اس کے

علاوہ پت چڑھ کر اس کی طبیعت خراب ہوگئی، تو تجھے ہی بھگتنا پڑے گا۔"

دھوپ کی طرف دیکھ کر بندو خود ہی نرم پڑ گئی۔ اس نے کدم کو بُلا کر کہا۔" جالے آ اُسے۔ مگر تم لوگوں سے کہے دیتی ہوں، جیجی آئندہ میری بات میں کوئی دخل دے گا، تو اچھا نہ ہوگا۔"

اس روز یہیں تک معاملہ ختم ہوگیا۔

چھوٹے بھائی کی وکالت چل جانے کے بعد سے یادو نوکری چھوڑ کر اپنی زمین جائیداد کی دیکھ بھال کرنے لگے تھے۔ چھوٹی بہو کے ذریعہ جو دس ہزار روپے ہاتھ لگے تھے۔ انہیں بھی انہوں نے سود پر دے کر تقریباً دُونے کر لئے تھے۔ اور ان روپیوں میں سے کچھ لے کر اور یادھو کی آمدنی پر اعتماد کر کے تقریباً پاؤ کوس کی دُوری پر ایک بڑا سا مکان بنوانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ قریب دس روز ہوئے وہ مکان بن کر تیار ہو گیا تھا۔ طے پایا تھا۔ کہ درگا پوجا کے بعد کوئی اچھا دن دیکھ کر سب وہیں جا کر رہیں گے۔ اس لئے ایک روز یادو نے کھانا کھاتے ہوئے چھوٹی بہو سے کہا۔" تمہارا مکان تو بن گیا بہو رانی اب کسی روز چل کر دیکھ آؤ۔ کچھ کسر تو نہیں رہ گئی ہے ؟"

بندو کو اس بات کی عادت سی ہوگئی تھی۔ کہ وہ ہر روز کام چھوڑ کر جیٹھ جی کے کھانے کے وقت دروازے کی اوٹ میں بیٹھی رہے۔ وہ جیٹھ کی دیوتا کی طرح عزت کیا کرتی تھی۔ سبھی کرتے تھے۔ وہ بولی۔" نہیں کوئی کسر نہیں رہی۔

یادو نے ہنس کر کہا۔" بغیر دیکھے ہی رائے دے دی بہو رانی۔ اچھا تو ٹھیک ہے۔ مگر ایک بات ہے میری خواہش ہے کہ اپنے جتنے اعزا و اقربا جہاں کہیں بھی ہوں۔ سب کو بُلا کر ایک اچھی ساعت دیکھ کر وہاں چلے چلیں، جا کر گرہ (خاندانی) دیوتا کی پوجا کرائیں ـــ کیوں ٹھیک ہے نا ؟"

بندو نے آہستہ سے کہا: "جیجی سے کہوں۔ وہ جو کہیں گی وہی ہوگا۔"
یادو نے کہا۔ "کہو۔ مگر تمہیں ہمارے گھر کی لچھمی ہو، تمہاری ہی مرضی سے سب کام ہوگا۔"

اپورنا پاس ہی بیٹھی تھی۔ ہنس کر بولی: "اگر تمہاری لچھمی بہو ذرا سرد مزاج ہوتی۔ ۔ ۔ ۔"

یادو نے کہا: "سرد مزاج ہونے کی بھلا کیا بات ہے! میری بہو رانی تو بالکل جگدھاتری ہیں۔ بر دان بھی دیتی ہیں اور ضرورت پڑنے پر تلوار بھی اٹھا لیتی ہیں ایسا ہی تو میں چاہتا ہوں۔ بہو رانی کو لانے کے بعد سے میرے گھر میں ذرا بھی تکلیف اور پریشانی نہیں رہی۔"

اپورنا نے کہا: "یہ بات تو تمہاری سچی ہے۔ اس کے آنے کے قبل کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔"

بندو نے شرمندہ ہو کر اس بات کو دبا دیا کہا: "آپ سب کو بلا لیجئے وہ مکان کافی بڑا ہے۔ کسی کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اگر وہ لوگ چاہیں۔ تو چار چھہ مہینے رہ بھی سکتے ہیں۔"

یادو نے کہا: "ایسا ہی ہوگا بہو۔ میں کل ہی بلوانے کا انتظام کرتا ہوں۔"

× × × × × × ×

(۴)

یادو کی پھوپھیری بہن ایلوکیشی کی حالت اچھی نہ تھی۔ وہ اس کے لئے اکثر مالی مدد بھیجا کرتے تھے۔ کچھ دنوں سے وہ خطوں میں اپنے لڑکے نربندر کو

یہیں رکھ کر پڑھانے لکھانے کی خواہش ظاہر کر رہی تھی۔ اتنے میں ایک روز وہ اپنے لڑکے کو لے کر اُتر پاڑا سے آ بھی گئی۔ یہ ٹھیک طور سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے شوہر پریہ ناتھ وہاں کیا کرتے ہیں۔ تین دن بعد وہ بھی آ پہنچے۔ نریندر کی عمر سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ وہ چوڑے کنارے کی دھوتی گھما کر پہنا کرتا تھا۔ اور دن میں آٹھ دس بار بال سنوارتا تھا۔ اس کی زلفیں واقعی دیکھنے کے لائق تھیں۔ آج شام کے بعد رسوئی گھر کے برآمدے میں سب اکٹھے بیٹھے تھے۔ اور ایلوکیشی اپنے بیٹے کے غیر معمولی محاسن و خوبی کا تذکرہ کر رہی تھی۔

بندو نے پوچھا۔ "نریندر! کس کلاس میں پڑھتے ہو بیٹا؟"

نریندر نے کہا "فورتھ کلاس میں۔ رائل ریڈر، گرامر، جغرافیہ، ارتھمیٹک اور بھی کتنی ہی چیزیں ہیں۔ ڈیسمل وسمل یہ سب تو تم سمجھو گی نہیں ممانی!"

ایلوکیشی نے فخر کے ساتھ اپنے بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھ بندو سے کہا۔ ارے ایک دو کتاب تھوڑے ہی ہے چھوٹی بہو۔ کتابوں کا پہاڑ ہے کل کتابیں بکس سے نکال کر اپنی ممانیوں کو ذرا دکھا دے تو بیٹا۔"

نریندر نے سر ہلا کر کہا۔ اچھا دکھاؤں گا۔"

بندو نے کہا "پاس ہونے میں تو ابھی دیر ہے۔"

ایلوکیشی نے کہا "دیر تھوڑی ہی رہتی چھوٹی بہو۔ دیر نہ رہتی۔ اب تک ایک ہی کیا؟ چار پاس ہو جاتا۔ صرف کمو نے ماسٹر کی وجہ سے نہیں ہو رہا ہے اس کا ستیاناس ہو جائے۔ میرے لال کو وہ کیسی زہر کی نگاہ سے دیکھتا ہے ماسے وہی جانے۔ اس کو وہ درجہ تھوڑے چڑھاتا ہے۔ چڑھاتا ہی نہیں جلن کے مارے وہ سال کے سال اسے ایک ہی کلاس میں پڑا رہنے دیتا ہے۔"

بندو نے حیران ہو کر کہا " نہیں تو، ایسا نہیں ہوتا "

ایلوکیشی نے کہا " سراسر ہوتا ہے۔ ہوتا کیوں نہیں؟ تمام ماسٹر رائے کرکے رشوت چاہتے ہیں۔ میں غریب ٹھہری۔ رشوت کے روپے کہاں سے لاؤں۔ تمہیں بتاؤ "

بندو چپ رہی۔ انپورنا نے دل سے غمزدہ ہو کر کہا " بھلا اس طرح کہیں آدمی کے پیچھے لگا جاتا ہے؟ کیا یہ اچھا کام ہے؟ لیکن ہمارے یہاں یہ سب باتیں نہیں ہیں۔ ہمارا للا تو ہر سال اچھی اچھی کتابیں انعام پاتا ہے مگر کبھی رشوت وغیرہ کچھ نہیں دینی پڑتی "

اتنے میں امول کہیں سے آکر آہستہ سے اپنی چھوٹی ماں کی گود میں بیٹھ گیا بیٹھتے ہی چھوٹی بہو کے گلے میں بانہہ ڈال کر کان ہی کان میں بولا " کل اتوار ہے چھوٹی ماں۔ آج ماسٹر جی کو چلے جانے کے لئے کہہ دو نہ "

بندو نے ہنس کر کہا " اس لڑکے کو دیکھ رہی ہو بی بی جی۔ اسے کہانی سننے کو مل جائے تو پھر اٹھنا کسے کہتے ہیں۔ جانتا ہی نہیں ——— کدم! ماسٹر جی سے کہہ تو آ۔ للا آج نہیں پڑھے گا؟ "

نریندر نے متعجب ہو کر کہا۔ یہ کیا رے امول اتنا بڑا ہو کر اب بھی عورتوں کی گود میں جا کر بیٹھتا ہے "

بندو نے ہنسکر کہا۔ کیا صرف یہی کرتا ہے! اب بھی یہ رات کو . . . . "

امول نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا " نہ کہنا چھوٹی ماں، نہ کہنا! "

بندو نے نہیں کہا۔ لیکن انپورنا نے کہہ دیا۔ بولی " یہ اب بھی رات کو

اپنی چھوٹی ماں کے ساتھ سوتا ہے۔"

بندو نے کہا۔ صرف سوتا ہی تھوڑا ہے جیجی۔ ساری رات چمگادڑ کی طرح چمٹا رہتا ہے۔"

امول نے شرم کے مارے اپنی چھوٹی ماں کی چھاتی میں منھ چھپا لیا۔

نریندر نے کہا۔" چھی چھی، کیسا ہے رے تو! تو انگریزی پڑھتا ہے؟"

اپنورنا نے کہا۔ پڑھتا کیوں نہیں، اسکول میں انگریزی ہی تو پڑھتا ہے۔"

نریندر نے کہا۔" اونہہ۔ انگریزی پڑھتا ہے۔ اچھا۔" انجن" کے اسپیلنگ بتائے تو سہی۔ دیکھوں ۔۔ " بتا چکا؟"

ایلوکیشی نے کہا۔" یہ سب مشکل الفاظ ہیں۔ بچہ ہے ابھی، بھلا کیسے بتا سکتا ہے؟"

اپنورنا نے کہا۔" اچھا للّا بتا نا تو؟"

مگر امول نے کسی طرح سر ہی اوپر نہ اٹھایا۔

بندو نے اس کے سر کو اپنی چھاتی سے اور چمٹا کر کہا۔" تم سب نے مل کر اسے شرمندہ کر دیا۔ اب وہ کیسے بتائے گا؟"

اس کے بعد ایلوکیشی کی طرف دیکھ کر کہا۔" اب کی سال یہ امتحان دیگا ماسٹر جی نے کہا ہے۔ للّا کو بیس روپے انعام ملے گا۔ ان روپیوں سے یہ اپنے چچا کی طرح ایک گھوڑا خریدے گا۔

بات سچی ہونے پر بھی مذاق کے طور پر سب ہنسنے لگے

ایلوکیشی نے بعد نے کہا۔" میرا نریندر ناتھ صرف لکھنے پڑھنے

ہی میں تیز نہیں ہے۔ یہ تھیئٹر میں ایسی ایکٹنگ کرتا ہے کہ لوگوں کے بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ اس بار سیتا بن کر کیسا پارٹ کیا تھا۔ دکھا نہ بیٹا۔ ماؤں کو ذرا دکھا تو دے۔"

نریندر نے اسی وقت گھٹنے ٹیک کر ہاتھ جوڑ کر بلند نکی آواز میں شروع کر دیا۔" پرانیشور! کیسے بُرے وقت میں تمہاری داسی ..."

بندو نے پریشان ہو کر کہا" ارے ٹھیر ٹھیر چپ رہ۔ جیٹھ جی اوپر موجود ہیں"

نریندر چونک کر چُپ ہو گیا۔

انپورنا ذرا سا ہی سن کر سحر زدہ ہو گئی تھی بولی یہ سُن لیں گے تو سن لینے دے، یہ تو ٹھاکر جی کی کتھا ہے۔ اچھی ہی بات تو ہے چھوٹی بہو"

بندو نے کہا" تو رہنے دو۔ میں ساونتری کا پارٹ کرتا ہوں۔

بندو نے کہا۔ نہیں"

اس بات کو سُن کر اب جا کر انپورنا کو ہوش آیا۔ کہ بات بہت دُور تک پہنچ گئی ہے اور یہیں اس کا خاتمہ نہ ہوگا۔ ایلوکیشی نئی آئی ہے۔ وہ اندر کی بات نہ سمجھ سکی۔ بولی، اچھا ابھی رہنے دے۔ مردوں کے چلے جانے پر پھر کسی روز دوپہر کو ہو سکے گا۔

" اور گانا بجانا بھی کیا کم سیکھا ہے؟ دمنتی لے جو روتے ہوئے گاتا گاتا تھا۔ اسے ایک بار بھی گا کر سنانا تو بیٹا۔ اسے سُنکر پھر تیری ماں تجھے چھوڑے گی تھوڑے ہی"

نریندر نے کہا" ابھی گاؤں؟"

غصہ کے مارے بندو کے بدن میں آگ سی لگ رہی تھی۔ وہ کچھ

نہ بولی۔"

انپورنا نے فوراً کہا۔" نہیں نہیں ابھی گانا وانا رہنے دو۔"

نریندر نے کہا۔" اچھا وہ گانا میں اموّل کو سکھا دونگا۔ میں بجانا بھی جانتا ہوں۔" ٹریکٹ تاک" بجانا بڑا مشکل ہے مائی، اچھا اس پیتل کے برتن کو اُٹھا دینا ذرا۔ دکھا دوں۔"

بندو للاّ کو اُٹھنے کا اشارہ کرکے بولی۔" جا للاّ گھر میں جا کر پڑھ تو۔"

للاّ جی لگا کر سن رہا تھا۔ اس کا اُٹھنے کا دل نہ چاہتا تھا۔ وہ چُپکے سے بولا۔" اور تھوڑی دیر بیٹھو نہ چھوٹی ماں۔"

بندو نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ اسے اٹھا کر اپنے ساتھ کمرے میں لے گئی انپورنا سمجھ گئی کہ وہ یکایک کیوں ایسی ہوگئی۔ اور یہ بھی صاف سمجھ گئی کہ اس ڈر سے کہ کہیں صحبت کے اثر سے للاّ بگڑ نہ جائے۔ نریندر کا یہاں رہ کر لکھنا پڑھنا بھی پسند نہ کرے گی۔ وہ اس سے مضطرب ہوگئی، بولی۔" بیٹا نرین، تم اپنی چھوٹی ماں کے سامنے یہ ایکٹنگ ویکٹنگ نہ کرنا۔ غصیل مزاج کی ٹھیریں۔ ان سب باتوں کو وہ پسند نہیں کرتیں۔"

ایلوکیشی نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔" چھوٹی بہو کو یہ سب باتیں اچھی نہیں لگتیں کیا؟ اس لئے اس طرح اُٹھ کر چلی گئی ہیں؟ ایں!"

انپورنا نے کہا۔" ہو سکتا ہے۔ ایک بات اور ہے بیٹا۔ تم اپنا کھانا پینا اور پڑھنا لکھنا اچھی طرح کرنا۔ ایسی کوشش کرنا جس سے ان کا دکھ دور ہو۔ تم للاّ کے ساتھ زیادہ نہ ملنا جلنا بیٹا، وہ بچہ ہے۔ تم سے بہت چھوٹا ٹھیرا۔ اچھا!"

یہ بات ایلوکیشی کو اچھا نہیں معلوم ہوئی۔ بولی" یہ تو ٹھیک ہی ہے غریب کا لڑکا ہے۔ اسے غریبوں ہی کی طرح رہنا چاہئے۔ لیکن تم نے چھیڑا ہی ہے تو

میں بھی کہہ دوں بھابی۔ اگر تمہارا امول ننھا سا بچہ ہے تو میرا نرین ہی ایسا کون سا بوڑھا ہو گیا؟ ایک آدھ سال کے بڑے کو بڑا نہیں کہا جاتا۔ اور اس نے کیا کبھی بڑے آدمیوں کے لڑکے نہیں دیکھے۔ کیا یہیں آکر دیکھ رہا ہے! اس کے تھیٹر میں تو نہ جانے کتنے راجے مہاراجوں کے لڑکے بھی موجود ہیں۔"

انپورنا کچھ خفیف ہو کر بولی "نہیں بی بی جی۔ میں نے یہ نہیں کہا۔ میں تو کہتی ہوں کہ۔۔۔۔"

اور کیسے کہو گی بڑی بہو؟ ہم لوگ بیوقوف ہیں — تو کیا اتنی بیوقوف ہوں کہ اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکتی۔ ارے بھیا نے کہا تھا کہ نرین یہیں رہ کر پڑھے گا اسی لئے لے آئی ہوں۔ نہیں تو کیا وہاں ہم لوگوں کے دن نہ کٹتے تھے؟"

انپورنا شرم کے مارے گڑ گئی۔ بولی۔ بھگوان جانتے ہیں بی بی جی۔ میں نے یہ بات نہیں کہی۔ میں کہہ رہی تھی۔ کہ جس سے ماں کا دکھ دور ہو ایسا۔۔۔۔"

ایلوکیشی نے کہا "اچھا یہی سہی۔ یہی سہی جائے نرین تو باہر جا کر بیٹھ بڑے آدمیوں کے لڑکے سے نہ ملنا جلنا" یہ کہہ کر انہوں نے اپنے لڑکے کو اٹھایا اور خود بھی اٹھ کر چل دیں"

انپورنا آندھی کی طرح بندو کے کمرے میں جا پہنچی۔ اور گلوگیر آواز سے کہنے لگی "کیوں ری کیا تیرے لئے ناطے رشتے داری بھی توڑ دینی پڑیگی؟ کیوں وہاں سے اٹھ آئی بتا تو سہی"

بندو نے نہایت فطری طور پر جواب دیا۔ "کیوں توڑو گی کیوں۔ جی۔ جی

ناطے رشتے داروں کو لے کر تم موج سے گھر میں رہو۔ میں اپنے للّا کو لے کر بھاگ جاؤں؟ یہی کہتی ہو نہ؟"

"بھاگ کہاں جاؤ گی؟ سنوں تو سہی"

بندو نے کہا۔ "جاتے وقت تمہیں پتہ بتا جاؤں گی۔ فکر نہ کرو"

اپورنا بولی۔ "وہ معلوم ہے جانتی ہوں۔ تاکہ پانچ آدمیوں کے سامنے مُنہ نہ دکھایا جا سکے۔ اسے تو بغیر کٹے مارے گی تھوڑے ہی' اس کے مارے میرا تو بدن جل کر خاک ہو گیا!" کہتی ہوئی باہر نکلی جا رہی تھی۔ اتنے میں مادھو کو گھر میں گھستے دیکھ کر پھر جل اُٹھی۔ "نہیں لالہ جی' تم لوگ اور کہیں جا کر رہو نہیں تو اس بہو کو رخصت کر دو۔ اب مجھ سے رکھی نہیں جاتی۔ میں تم سے آج صاف کہے دیتی ہوں" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

مادھو نے حیران ہو کر اپنی بیوی سے پوچھا "کیا بات ہے؟"

بندو نے کہا "میں نہیں جانتی۔ جیٹھانی جی سے کہہ دیا ہے۔ ہم لوگوں کو الگ ہو جانا چاہئے"

مادھو نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔ وہ ٹیبل پر سے اخبار اٹھا کر اندر والے کمرے میں چلے گئے۔

× × × × × × × ×

(۵)

بی بی جی یوں دیکھنے میں بھولی سی معلوم ہوتی ہوں۔ مگر دراصل وہ بھولی نہ تھیں۔ انہوں نے جیسے ہی دیکھا کہ بے اولاد چھوٹی بہو کے پاس کافی روپیہ ہے۔ ایسے ہی وہ فوراً اس طرف جھک گئی اور ہر رات کو سوتے وقت

بلاناغہ اپنے شوہر کو ڈانٹنے ڈپٹنے لگیں "تمہارے ہی وجہ سے میرا سب کچھ گیا تمہارے پاس یونہی پڑی نہ رہ کر اگر میں یہاں آکر رہتی تو آج راجا کی ماں ہوتی۔ میرے ایسے سونے کے چندا سے لال کو چھوڑ کر بیاہ اس کالے کلوٹے کو چھوٹی بہو" کہتی ہوئی ایک گہری اور لمبی سانس کے ذریعہ اس کالے کلوٹے لڑکے کی ہستی کو بالکل بے حقیقت قرار دے کر کہتیں۔ غریبوں کے بھگوان ہیں" اور اس طرح اس کی بیخ کنی کر کے چپ چاپ سو جاتیں۔ پر یہ ناتھ بھی اپنی بیوتوفی پر دل ہی دل میں افسوس کرتے ہوئے سو جایا کرتے۔ اسی طرح ان بیوی شوہر کے دن کٹ رہے تھے اور چھوٹی بہو کی طرف بی بی جی کی شفقت و محبت سیلاب کی طرح تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔

آج دوپہر کو وہ کہنے لگیں "چھوٹی بہو تمہارے بال ایسے بادل سے کالے ہیں لیکن کبھی تم کو جُوڑا باندھتے نہیں دیکھا۔ آج زمیندار کے گھر کی عورتیں گھومنے آئیں گی۔ لاؤ جوڑا باندھ دُوں "

بندو نے کہا۔ نہیں بی بی جی۔ مجھ سے سر پر کپڑا نہیں رکھا جاتا۔ لڑکا بڑا ہو گیا ہے دیکھے گا؟"

بی بی جی دنگ رہ گئیں۔ بولیں " یہ کیسی بات کر رہی ہو تم چھوٹی بہو۔ لڑکا بڑا ہو گیا ہے۔ اس لئے بہو بیٹیاں جوڑا نہ باندھیں گی۔ میرا نریندر ناتھ تو دشمنوں کے منہ پر خاک پڑے اس سے اور بھی چھ مہینے بڑا ہے تو کیا میں بال باندھنا چھوڑ دوں ؟"

بندو نے کہا۔ تم کیوں چھوڑنے لگیں بی بی جی۔ نرائن برابر دیکھتا آرہا ہے۔ اس کی بات جدا ہے۔ لیکن للّا اگر اچانک دیکھے کہ جوڑا بندھا ہے، تو منہ پھاڑے دیکھتا رہ جائے گا معلوم نہیں۔ شاید شور مچائے یا

کیا کرے۔ تب پھر چھی چھی بڑے شرم کی بات ہوگی "

اپنورنا یکایک اسی طرف سے نکلی۔ اور بندو کو دیکھ کر کھڑی ہوگئی اور بولی "تیری آنکھیں چھلچھلا کیوں رہی ہیں چھوٹی بہو۔ آتو تیرا بدن دیکھوں"

بندو ایلوکیشی کے سامنے نہایت شرمندہ ہوگئی بولی "روز روز کیا بدن دیکھو گی! میں کیا ننھی بچی ہوں۔ جو طبیعت خراب ہونے پر نہ سمجھوں گی"

اپنورنا نے کہا "نہیں تو بوڑھی ہے۔ میرے پاس تو آ۔ بھادوں کنوار کا مہینہ ہے۔ وقت اچھا نہیں ہے"

بندو نے کہا "ہرگز نہیں آؤں گی۔ کہتی ہوں۔ کچھ نہیں ہوا مزے میں ہوں۔ پھر بھی کہتی ہو پاس آؤ"

" دیکھنا۔ چھپانا نہ کہیں" کہہ کر اپنورنا مشتبہ نظروں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔

ایلوکیشی نے کہا "بڑی بہو کو کچھ جنون کا بھی اثر ہے کیا؟"

بندو کچھ دیر خاموش رہ کر بولی "بھگوان کریں ایسا جنون سب کو رہے بی بی جی"

ایلوکیشی چپ ہو رہی۔

اپنورنا کوئی چیز ہاتھ میں لئے پھر اسی طرف سے لوٹ رہی تھی۔ بندو نے بلا کر کہا "جی جی سنو سنو۔ جوڑا بندھواؤ گی؟"

اپنورنا مڑ کر کھڑی ہوگئی۔ کچھ لمحہ چپ چاپ دیکھ بھال کر سب بات سمجھ کر ایلوکیشی سے بولی۔ میں نے بہت کہا ہے بی بی جی۔ اس سے کہنا سننا فضول ہے۔ اتنے بال ہیں باندھے گی نہیں۔ اتنے کپڑے گہنے ہیں پہنے گی نہیں اتنا روپ ہے۔ مگر ایک بار اچھی طرح دیکھے گی بھی نہیں۔ اس کی

سب باتیں دُنیا سے نرالی ہیں۔ لڑکا بھی ویسا ہی ہے۔ اس روز للآ مجھ سے کیا کہتا ہے چھوٹی بہو۔۔۔ کہتا ہے کپڑے ویڑے پہننے سے کیا ہونا ہے؟ چھوٹی ماں کے بھی تو اتنے کپڑے ہیں کیا وہ پہنتی ہیں؟

بندو نے فخر سے سر اُٹھا کر ہنستے ہوئے کہا۔ مگر دیکھو جیجی۔ لڑکے کو اگر دس بیسا میں ایک۔۔۔ بڑا بنانا ہو تو ماں کو دُنیا سے نرالی ہونے کی ضرورت ہے۔ اگر میں تب تک زندہ رہی جیجی تو تم دیکھ لینا۔ دیش کے لوگ ہاتھ اُٹھا کر کہیں گے کہ یہ امول کی ماں ہے"۔ کہتے کہتے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

انپورنا نے یہ دیکھ کر محبت سے کہا۔ اسی لئے تو تیرے للآ کے بارے میں ہم سب کچھ کہتے نہیں۔ بھگوان تیری تمنا پوری کریں۔ لیکن۔ لیکن اتنی بڑی اُمید کو کہ لڑکا بڑا ہوگا۔ اور دس بیس میں ایک بنے گا۔ میں اپنے دل میں جگہ نہیں دیتی۔"

بندو نے آنچل سے آنکھیں خشک کر کے کہا۔ "مگر اسی ایک اُمید کے سہارے تو میں جی رہی ہوں جیجی"۔ "باپ رے۔ یکایک اس کے بدن کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے شرما کر زبردستی ہنستے ہوئے کہا۔ "نہیں جیجی اس اُمید کو اگر کسی دن صدمہ پہنچا تو میں پاگل ہو جاؤں گی"۔

انپورنا مبہوت رہ گئی۔ یہ بات نہ تھی کہ وہ اپنی دیورانی کے من کی بات نہ جانتی ہو۔ لیکن اس کی امید و آرزو کا ایسا تیز عکس اس نے کبھی اس طرح صاف طور پر نہیں دیکھا تھا۔ آج اسے ہوش آیا۔ کہ بندو امول کے بارے میں کیوں لچھمی (دولت کے دیوتا کے جاسوس) کی طرح محتاط رہتی ہے۔ بھوت کی طرح محتاط۔ اپنے بیٹے کی اس کامل خیر اندیش عورت کے چہرے کی طرف دیکھ کر ایک ناقابل بیان عقیدت کی لذت و شیرینی سے اس کا

مادرانہ دل لبریز ہوگیا۔ اس نے نکلتے ہوئے آنسوؤں کو چھپاتے کے لئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ایلو کیشی نے کہا "تو ہونے دو چھوٹی بہو۔ آج تمہارے ..."

بندو نے فوراً بات کاٹ کر کہا "ہاں بی بی جی۔ آج جیجی کا جوڑا باندھ دو۔۔۔ اس گھر میں آکر آج تک کبھی نہیں دیکھا" کہہ کر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

پانچ چھ دن کے بعد ایک روز صبح اس گھر کا پرانا نائی یادو کی حجامت بنا کر اوپر سے اُتر رہا تھا۔ امول نے آکر اس کا راستہ روک لیا اور کہا۔ کیلاش بھیا۔ میرے نریندر بھیا جیسے بال بنا سکتے ہو؟"

نائی کو بڑا تعجب ہوا۔ بولا "کیسے بال۔ بھیا جی"

امول نے اپنے سر پر جگہ جگہ اشارہ کر کے دکھاتے ہوئے کہا۔ دیکھو یہاں بارہ آنے۔ یہاں چھ آنے۔ یہاں دو آنے اور یہاں گردن کے پاس بالکل باریک کر کے ترشنا۔ تراش سکو گے؟"

نائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ نہیں بھیا جی۔ ویسے تو میرے باپ سے بھی نہ بنیں گے"

مگر امول نے نہ چھوڑا۔ ہمت کے ساتھ کہا "یہ مشکل نہیں ہے کیلاش بھیا یہاں بارہ آنے۔ یہاں چھ آنے ...."

نائی نے چھٹکارا پانے کی ترکیب نکال کر کہا۔ مگر آج دن کون سا ہے تمہاری چھوٹی ماں کا حکم پائے بغیر نہیں تراش سکتا بھیا جی"

امول نے کہا "اچھا ٹھیرو۔ میں پوچھے آتا ہوں" کہہ کر ایک قدم آگے بڑھ کر پھر لوٹ آیا۔ بولا "اچھا تم اپنی چھتری مجھے دے دو۔ نہیں تو تم بھاگ جاؤ گے" کہہ کر وہ زبردستی چھتری چھین کر بھاگ گیا۔

پھر آندھی کی طرح اپنی چھوٹی ماں کے کمرے میں گھستے ہی بولا۔ چھوٹی ماں! ذرا جلدی آؤ نہ باہر۔"

چھوٹی ماں ابھی فوراً ہی نہا دھو کر پوجا پر بیٹھ رہی تھی۔ پریشان ہو کر بولی "ارے چھونا مت۔ چھونا مت۔ پوجا کرتی ہوں۔" پوجا [illegible] میں کرنا چھوٹی ماں۔ ذرا باہر چل کر حکم دے آؤ نہیں تو وہ بال نہیں تراشتا باہر کھڑا ہے۔"

بندو کو کچھ تعجب ہوا۔ اس کے بال ترشوانے کے لئے ہمیشہ مار پیٹ کرنی پڑتی ہے۔ آج وہ اپنی خواہش سے کیوں بال ترشوانا چاہتا ہے۔ سمجھ میں نہ آنے سے وہ باہر نکل آئی۔ آتے ہی نائی نے کہا "بڑی سخت فرمائش ہے ماں جی۔ نریندر بابو کی طرح بارہ آنے۔ چھ آنے۔ تین آنے۔ دو آنے، ایک آنے بال ترشواتے ہوں گے۔ تو کیا میں تراش سکوں گا؟!"

اموّل نے کہا۔ خوب تراش سکو گے! اچھا ٹھیرو۔ نریندر بھیا کو بلا لاؤں!" کہہ کر دوڑا چلا گیا۔

نریندر گھر پر نہ تھا۔ کچھ دیر ڈھونڈھ ڈھانڈھ کر وہ واپس چلا آیا۔ اور بولا "ہے نہیں ابھی۔ اچھا نہ سہی چھوٹی ماں۔ تم کھڑی رہ کر دکھا دو نہ۔"

اچھی طرح دیکھنا۔ یہاں بارہ آنے۔ یہاں چھ آنے۔ یہاں دو آنے۔ یہاں بالکل چھوٹے!"

اس کا اضطراب دیکھ کر بندو کو ہنسی آ گئی بولی۔ ابھی پوجا کرنی ہے رے!

"پوجا بعد میں کرنا۔ نہیں تو چھو دوں گا"
بندو کو اور کوئی صورت نہ دیکھ کر کھڑا رہنا پڑا۔

نائی بال تراشنے لگا۔ بندو نے آنکھوں سے اشارہ کر دیا۔ اس نے سب بال برابر ایک سے تراش دئے۔ امول نے سر پر ہاتھ پھیر کر خوش ہو کر کہا۔

"بس ٹھیک ہے۔ اور اچھلتا کودتا ہوا چلا گیا۔

نائی نے چھتری بغل میں داب کر کہا" مگر ماں جی کل اس گھر میں گھسنا مشکل ہو جائے گا"

مہرانی تھال رکھ کر کھانے کو بلا رہی تھی۔ بندو رسوئی گھر میں ایک طرف بیٹھی کٹورے میں دودھ بھر رہی تھی۔ اتنے میں اس نے سنا کہ للّا گھر بھر میں چچا کا بال جھاڑنے کا برش ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ روتا ہوا آیا۔ اور بندو کی پشت پر جھک کر بولا "کچھ بھی نہیں ہوا چھوٹی ماں۔ اس نے سب بال خراب کر دئے ہیں۔ کل میں اسے مار ہی ڈالوں گا"

اب بندو اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ امول نے پیٹھ چھوڑ کر غصہ کے مارے روتے روتے کہا "کیا تم اندر رہی تھیں؟ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا تھا تمہیں؟"

انپورنا رونے کی آواز سن کر رسوئی گھر میں آ پہنچی۔ اور سب سن سنا کر بولی "اس میں کیا ہو گیا۔ کل ٹھیک سے تراشنے کے لئے کہہ دوں گی۔ امول نے اور بھی غصہ ہو کر کہا "کل کیسے بارہ آنے ہوں گے۔ یہاں بال ہی کہاں ہیں؟"

انپورنا نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کہا۔ بارہ آنے نہ سہی۔ آٹھ آنے دس آنے تو ہو سکتے ہیں۔"

"خاک ہوں گے۔ آٹھ آنے دس آنے کا کیا فیشن ہے۔ نریندر بھیا سے پوچھو نہ۔ بارہ آنے چاہیئے یہاں!"

اس روز اموں نے اچھی طرح روٹی بھی نہ کھائی۔ پھینک پھانک کر اُٹھ کر چلا گیا۔

انپورنا نے کہا۔ تیرے لڑکے کو زلفیں رکھنے کا شوق کب سے ہو گیا ری۔"

بندو ہنس دی مگر دوسرے ہی لمحہ سنجیدہ بن کر ایک لمبی سانس لے کر بولی "جیجی بات تو معمولی سی ہے۔ یوں ہی ہنس رہی ہوں۔ مگر ڈر کے مارے اندر ہی اندر میری چھاتی پھٹی جا رہی ہے۔ سبھی باتیں اسی طرح شروع ہوا کرتی ہیں۔"

انپورنا سے بھی اس کے بعد کچھ نہ کہا گیا۔

× × × × × ×

دُرگا پُوجا آگئی۔ اسی محلے کے زمینداروں کے گھر عیش و تفریح کا کافی انتظام ہوا تھا۔ دو روز پہلے ہی سے نریندر اس میں کھو گیا۔

سپتمی کی رات کو للّا آکر چھوٹی بہو کے پیچھے پڑ گیا "چھوٹی ماں! یاترا[۱] ہو رہی ہے۔ دیکھنے جاؤں؟"

چھوٹی ماں نے پوچھا۔ ہو رہی ہے یا ہو گی رے؟

اموں نے کہا "نریندر بھیا کہتا ہے۔ رات کے تین بجے سے شروع ہو گی

---

[۱] بغیر منظر کے ڈرامے کو کہتے ہیں؟

"تو ابھی سے ساری رات اوس میں پڑا رہے گا؟ یہ نہیں ہو سکتا کل سویرے اپنے چچا کے ساتھ جانا۔ بہت اچھی جگہ ملے گی۔"

امول رونی صورت بنا کر بولا۔ "نہیں تم بھیج دو۔ چچا شاید نہ جائیں گے اور جائیں گے بھی تو بہت دیر کر دیں گے۔"

بندو نے کہا "تین چار بجے تو شروع ہو گی۔ میں تجھے نوکر کے ساتھ بھیج دوں گی۔ ابھی سو رہو جا کر۔"

امول غصہ ہو کر بچھونے کے ایک کنارے دیوار کی طرف منہ کر کے پڑ رہا۔

بندو اسے کھینچنے گئی۔ تو وہ ہاتھ ہٹا کر اکڑ کر پڑا رہا اس کے بعد کچھ دیر کے لئے شاید سب سو گئے تھے۔ باہر کی بڑی گھڑی کی آواز سے امول کی نیند ٹوٹ گئی۔ وہ کان کھڑے کر کے گننے لگا۔ ایک دو تین چار وہ کھڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اور بندو کو زور سے جھنجوڑ کر بولا "اٹھو اٹھو چھوٹی ماں۔ تین چار بج گئے۔ باہر کی گھڑی میں بجنے لگے۔ پانچ چھ سات آٹھ۔ امول رو پڑا۔ بولا "سات تو بج گئے۔ کب جاؤں گا؟" باہر کی گھڑی میں ابھی بجنا ہی جا رہا تھا۔ نو۔ دس۔ گیارہ۔ بارہ؟ گھڑی بارہ بجا کر رک گئی۔ امول اپنی غلطی کو محسوس کر کے شرمندہ ہو کر چپ چاپ سو گیا۔

کمرے کے اس طرف والے پلنگ پر ماڈھو سویا کرتے ہیں، شور و غل کے باعث ان کی نیند بھی اچٹ گئی تھی۔

وہ زور سے ہنس کر بولے "کیا ہوا رے للا!"

للا نے مارے شرم کے کوئی جواب نہیں دیا۔

بندو نے ہنس کر کہا "آج اس نے جس طرح مجھے جگایا ہے سارے

گھر میں آگ لگ جانے پر بھی کوئی اس طرح نہ جگاتا۔"
امول کو چپ چاپ پڑے دیکھ کر اسے ترس آگیا۔ اس نے کہا: "اچھا جا۔ مگر کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کرنا۔"
اس کے بعد بھیرو کو بلاکر لالٹین کے ساتھ اسے بھیج دیا۔
دوسرے روز دن کے دس بجے "یاترا" دیکھ کر خوش خوش للا گھر لوٹا۔ آتے ہی چچا کو دیکھ کر بولا: "کہاں تم تو گئے نہیں؟"
بندو نے پوچھا۔ کیسی تھی رے!"
"بہت اچھی چھوٹی ماں۔ چچا آج شام کو اچھا ناچ ہوگا۔ کلکتے سے دو ناچنے والی آئی ہیں۔ نریندر بھیّا دیکھ آیا ہے انہیں۔ ٹھیک چھوٹی ماں کی طرح ہیں، بہت اچھی طرح ہیں دیکھنے میں۔ وہ ناچیں گی۔ بابو جی سے بھی کہہ دیا ہے۔"
بہت اچھا کیا۔" یہ کہہ کر مادھو قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔
غصّے کے باعث بندو کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ بولی۔ اپنے لائق بھتیجے کی بات سُن لی۔"
پھر للا سے بولی: "اب تو بالکل وہاں نہ جانا۔ حرامزادے۔ بدمعاش! کس نے کہا تھا تجھ سے کہ میری جیسی ہیں؟ نریندر نے!" امول نے ڈرتے ہوئے کہا۔ اس نے دیکھا ہے جو؟"
کہاں ہے نریندر؟ اچھا آنے دو اسے!"
مادھو نے ہنسی کو روکتے ہوئے کہا: "پاگل ہو تم۔ بھیّا نے سُن لیا ہے اب شور نہ کرو۔"
لہٰذا بندو بات کو خود پی گئی۔ اور اندر ہی اندر جلنے لگی۔

شام ہوتے ہی امول آکر اپنورنا کے پیچھے پڑ گیا۔ "جیجی پوجا والوں کے یہاں ناچ دیکھنے جاؤں گا۔ دیکھ کر ابھی لوٹ آؤں گا۔"

اپنورنا کام میں مشغول تھی۔ اس نے کہا" اپنی ماں سے پوچھ۔ جاکر۔"

امول ضد کرنے لگا۔" نہیں جیجی۔ ابھی لوٹ آؤں گا۔ تم کہہ دو۔ جاؤں نہ؟"

اپنورنا نے کہا۔" نہیں رے نہیں۔ وہ یونہی غصیل ہے۔ اس سے پوچھ کر جانا۔"

امول رونے لگا۔ اور ساری کا آنچل پکڑ کر کھینچا تانی کرنے لگا۔" تم چھوٹی ماں سے نہ کہنا۔ میں نریندر بھیّا کے ساتھ جاتا ہوں۔ ابھی لوٹ آؤں گا۔"

اپنورنا نے کہا۔" اگر نہ آئے تو...."

بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ امول فوراً دوڑ کر بھاگ گیا۔

گھنٹے بھر بعد اپنورنا کے کان میں بھنک پڑی۔ کہ بندو للا کو تلاش کر رہی ہے۔ یہ سن کر وہ خاموش رہی۔ جب اس کی تلاش بتدریج بڑھتی ہی گئی۔ تو اس نے باہر نکل کر کہا۔ کہیں ناچ ہو رہا ہے۔ نریندر کے ساتھ دیکھنے گیا ہے۔ ابھی لوٹنے کو کہہ گیا ہے۔ تو فکر نہ کر۔"

بندو نے پاس آکر پوچھا۔ کس نے جانے کو کہا ہے تم نے؟"

اپنورنا ڈر کے مارے اس بات کو منظور نہ کر سکی۔ کہ اپنورنا کی بغیر اجازت ہی خود بخود چلا گیا ہے۔ اس نے کہا۔" ابھی آجائے گا۔"

بندو کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ وہ وہیں سے چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد گھر آتے ہی امول نے جیسے ہی سنا کہ چھوٹی ماں بلا رہی تھیں وہ چپکے سے سیدھا اپنے باپ کے بستر پہ جاکر پڑ رہا۔

چراغ کے سامنے بیٹھے آنکھوں پر چشمہ لگائے یادو بھاگوت پڑھ

رہے تھے۔ وہ سر اُٹھا کر بولے "کون ہے رے للّا؟"

للّا نے جواب نہیں دیا۔

کدم نے آکر کہا "چھوٹی ماں بُلا رہی ہیں چلو"

امول اپنے باپ کے پاس جا کر ان سے چمٹ کر بیٹھ گیا۔ بولا بابوجی! تم چل کر پہنچا دو۔ چلو نہ؟

یادو نے حیران ہو کر کہا۔ میں پہنچا آؤں؟

کیوں؟ کیا ہوا ہے کدم؟"

کدم نے ساری بات سمجھا دی۔

یادو سمجھ گئے کہ اس بات پر جھگڑا ہونا لازمی ہے۔ ایک نے منع کیا ہے۔ ایک نے اجازت دی ہے۔

یادو امول کو ساتھ لے کر چھوٹی بہو کے کمرے کے باہر کھڑے ہو کر پکار کر بولے "اب کی بار معاف کر دو۔ بہو رانی۔ وہ کہہ رہا ہے۔ اب ایسا نہ کرے گا"

اسی رات کو دونوں بہوئیں کھانے کو بیٹھیں تو بندو نے کہا "میں تم پر غصہ نہیں ہو رہی ہوں جیجی۔ مگر اب میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ نہیں تو للّا کی عادت بالکل خراب ہو جائے گی۔ وہ اِکدم بگڑ جائے گا۔ میں اگر منع نہ کرتی۔ تب بھی ایک بات تھی۔ مگر تب سے میں صرف یہی سوچ رہی ہوں۔ کہ منع کرنے کے باوجود اتنی بڑی جرأت اسے کیونکر ہوئی؟ اس پر اس کی شرارت انگیز عقل تو دیکھو۔ میرے پاس نہیں گیا۔ کیا تمہارے پاس پوچھنے؟ اور گھر آکر جیسے ہی سُنا کہ میں اسے بلا رہی تھی۔ وہ فوراً پہنچ گیا۔ جیٹھ جی کے پاس۔ اور انہیں اپنے ساتھ لیتا آیا۔ نہیں جیجی اب تک یہ سب باتیں

نہیں تھیں۔ اب تو میں کلکتے میں کرائے پر مکان لے کر رہوں تو وہ اچھا۔ ایک ہی لڑکا ٹھیرا۔ وہ بھی اگر بگڑ جائے تو اسے لے کر میں زندگی بھر آنسوؤں میں تنہا نہیں رہ سکتی۔"

اپنورنا پریشان ہوگئی بولی۔ تم لوگ چلے جاؤ گے تو بھلا میں اکیلے کیسے رہ سکوں گی؟ بتاؤ؟"

بندو کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔" اسے تو تم جانو۔ میں جو کروں گی وہ تم سے کہہ چکی۔ بہت واہیات لڑکا ہے یہ نریندر!"

"کیوں کیا کیا نریندر نے! اور مان لے۔ اگر یہ دونوں بھائی ہوتے تو پھر کیا کرتی!"

بندو نے کہا۔" تو آج اسے نوکر سے ہاتھ پیر بندھوا کر اور "جل بچھوٹی" (ایک طرح کی پتی جس کے بدن پر لگتے ہی بڑی زور کی کھجلی ہوتی ہے) لگوا کر گھر سے نکال باہر کرتی۔ اس کے علاوہ" اگر کے" حساب سے کام نہیں ہوتا جیجی ان لوگوں کو تم چھوڑ دو۔"

اپورنا دل ہی دل میں ناخوش ہوئی۔ بولی۔" چھوڑ نا نہ چھوڑنا کیا میرے بس کی بات ہے چھوٹی بہو! جو انہیں لائے ہیں۔ ان سے کہہ نہ جاکر۔ یونہی مجھے بدنام نہ کر۔"

"یہ سب باتیں جیٹھ جی سے کہوں کیسے؟"

جیسے اور سب باتیں کہتی ہے۔ ویسے ہی کہہ جاکر۔"

بندو نے اپنے سامنے سے تھالی کھسکا کر کہا۔" مجھے نادان نہ سمجھو جیجی۔ میری بھی ستائیس اٹھائیس کی عمر ہو چلی۔ گھر کے نوکر چاکر کی بات نہیں ہے۔ اپنے ناتے رشتہ داروں کی۔ تمہارے جیٹھ جی یہ سب

باتیں ان سے کہوں گی تو جیٹھ جی غصہ نہ ہوں گے!

انپورنا نے کہا: ہاں ضرور ناراض ہوں گے۔ لیکن میں کہوں گی تو زندگی بھر صورت نہ دیکھیں گے۔ ہزار ہو تو کیا ہم لوگ دوسری ہیں۔ وہ بھائی بھتیجن ہیں اس بات کو کیوں نہیں سوچتیں؟ اس کے سوا میں بوڑھی بھیری، اس چھوٹی سی بات پر ناچنے لگوں تو لوگ پاگل نہ کہیں گے؟"

بندو اپنی تھالی کو ذرا اور بھی دھکیل کر گم سم ہو کر بیٹھی رہی

انپورنا سمجھ گئی۔ وہ صرف جیٹھ جی کے ڈر سے چپ رہ گئی ہے۔ بولی۔

"ہاتھ سمیٹے کیوں بیٹھی ہو۔ کھانے کی تھالی نے کیا قصور کیا ہے؟

بندو نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا: میں کھا چکی"

انپورنا کو اس کا مرخ دیکھ کر پھر کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی"

سونے گئی تو بندو بستر پر امول کو نہ دیکھ کر لوٹ آئی۔ اور جیٹھانی سے بولی

"وہ کہاں گیا؟"

انپورنا نے کہا: معلوم ہوتا ہے میرے بچھونے پر پڑا سو رہا ہے۔ جاؤں اٹھا دوں جا کر"

"نہیں نہیں رہنے دو" کہہ کر بندو منہ پھلا کر چلی گئی۔

آدھی رات کو انپورنا کی آواز سن کر بندو کی نیند کھل گئی۔ کہا ہے جی جی!"

"کواڑ کھول کر اپنا لڑکا سنبھال تو۔ اتنی شیطانی میرے باپ آجائیں تو ان سے بھی نہ برداشت ہو"

بندو کے کواڑ کھولتے ہی اس نے امول کے ساتھ گھر میں داخل ہوتے ہوئے کہا: چھوٹی بہو! میں نے تو ایسا لڑکا ہی نہیں دیکھا۔ رات کے دو

دو بج رہے ہیں۔ ایک بار پلک بھی جھپکنے نہیں دی۔ کبھی کہتا ہے۔ مچھّر کاٹتے ہیں۔ کبھی کہتا ہے پانی پیؤں گا۔ کبھی پنکھا جھلو۔ نہیں چھوٹی بہو میں دن بھر کام دھندے کرتے کرتے تھک جاتی ہوں رات کو بغیر سوئے تو میں زندہ نہیں رہ سکتی۔"

بندو نے جیسے ہی ہنسکر ہاتھ بڑھایا۔ للّا اس کی گود میں جاکر چمٹ گیا اور چھاتی پر سر رکھ کر ایک ہی منٹ میں سو گیا۔

مادھو نے اپنے بستر پر از راہ مذاق کہا "کیا شوق پورا ہو گیا بھابھی!

انپورنا نے کہا۔ میں نے شوق نہیں کیا لالہ جی۔ وہ خود ہی ڈر کے مارے وہاں گھس کر سو رہا تھا۔ لیکن ہاں مجھے سبق ضرور مل گیا اور کیسی شرم کی بات ہے لالہ جی۔ مجھ سے کہتا ہے تیرے پاس سونے میں شرم لگتی ہے"

تینوں ہنس پڑے۔ انپورنا نے کہا "اچھا بہت رات ہو گئی۔ اب جاتی ہوں۔ ذرا سو لوں چل کر" چلی گئی۔

x x x x

دس روز بعد۔ بندو کے ماں باپ نے تیرتھ یاترا کو جانے کے پہلے لڑکی کو دیکھنے کے لئے پالکی بھیج دی۔ بندو اپنی جیٹھانی سے اجازت لے کر دو تین روز کے لئے امول سے چھپا کر میکے جانے کی تیاری کرنے لگی۔ اتنے میں بغل میں کتابیں دبائے سکول جانے کے لئے تیار ہو کر امول بھی وہاں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ باہر راستے کے کنارے ایک پالکی رکھی دیکھ آیا تھا۔ اب یکا یک چھوٹی ماں کے پیروں پر نظر پڑتے ہی وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور بولا "پیروں میں مہاور کیوں لگایا ہے

چھوٹی ماں!"

انپورنا موجود تھی۔ ہنس دی۔

بندو نے کہا۔" آج لگایا جاتا ہے۔"

امول نے بار بار سر سے پیر تک دیکھ کر کہا۔" اور اتنے گہنے کیوں پہنے ہیں؟"

انپورنا منہ پر آنچل ڈال کر باہر نکل گئی۔

بندو نے اپنی ہنسی دبا کر کہا۔" نہ جانے کب تک تیری بہو آکر پہنے گی تو کیا ہم ابھی سے گہنے نہ پہنیں رہے؟ جا تو اسکول جا۔"

امول نے اس بات پر کان نہ دھرتے ہوئے کہا۔" جیجی اتنی ہنستی کیوں ہیں؟ میں تو آج اسکول نہیں جاؤں گا۔ تم کہاں جاؤ گی؟"

بندو نے کہا۔" اگر جاؤں بھی، تو کیا تیری اجازت لینی پڑیگی؟"

"میں بھی جاؤں گا۔" کہہ کر وہ کتابیں لے کر چل دیا۔

انپورنا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔" میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اتنی آسانی سے اسکول چلا جائے گا مگر کتنا چالاک ہے۔

دیکھا۔ کہتا ہے۔ مہاوا کیوں لگایا ہے؟ اتنے گہنے کیوں پہنے ہیں؟ لیکن میں کہتی ہوں لئے جا اسے ساتھ، نہیں تو اسکول سے لوٹ کر تجھے نہ دیکھے گا۔ تو بڑا اودھم مچائے گا۔"

بندو نے کہا۔" تم نے کیا سمجھ رکھا ہے جیجی۔ وہ اسکول گیا ہو گا! ہرگز نہیں۔ یہیں کہیں چھپا بیٹھا ہو گا۔ دیکھنا عین وقت پر حاضر ہو جائے گا۔"

اور ٹھیک یہی ہوا۔ وہ کہیں چھپا ہوا تھا۔ ابھی بندو انپورنا کے پیر چھو کر پالکی میں بیٹھ ہی رہی تھی کہ اتنے میں نہ جانے کہاں سے نکل کر وہ اس کا آنچل پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ دیورانی جیٹھانی دونوں کی دونوں ہنس پڑیں۔

انپورنا نے کہا "چلتے وقت اب مار پیٹ نہ کر۔ لے جا ساتھ"

بندو نے کہا۔ لے جانے کو تو میں لے جاؤں گی۔ لیکن پھر وہاں ایک قدم بھی نہ ہل سکوں گی۔ یہ تو بڑی مشکل کی بات ہے"

انپورنا نے کہا۔ جیسا کیا ہے ویسا ہی تو ہو گا۔ للا، رہ نہ جا تو دو دن میرے پاس"

للا نے سر ہلا کر کہا "نہیں نہیں تمہارے پاس نہیں رہ سکتا۔" اور پالکی میں جا کر بیٹھ گیا۔

× × × × ×

(۶)

بندو میکے سے لوٹ آئی اس کے دس روز بعد دوپہر کے وقت انپورنا نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا "چھوٹی بہو!"

تب چھوٹی بہو ڈھیر کے ڈھیر کپڑوں کے سامنے خاموش بیٹھی تھی

انپورنا نے کہا "دھوبی آیا ہے کیا"

چھوٹی بہو کچھ نہیں بولی۔ انپورنا اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر ڈر گئی۔ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ کیا ہوا ہے ری!"

بندو نے انگلی سے جلے ہوئے سگریٹوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے دکھا کر کہا "للا کے کرتے کی جیب میں سے یہ سب نکلے ہیں"

انپورنا ششدر سی کھڑی رہی۔

بندو نے کہا "تمہارے پیروں پڑتی ہوں جیجی، ان لوگوں کو رخصت کر دو۔ اور یہ نہ ہو سکے تو ہمیں لوگوں کو کہیں بھیج دو۔"

انپورنا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ کچھ دیر تک اور خاموش کھڑی رہنے کے بعد وہ چلی گئی۔

تیسرے پہر امول اسکول سے آ کر ناشتہ کر کے کھیلنے چلا گیا بندو نے اس سے کچھ بھی نہ کہا۔ بھیجو نوکر شکایت کرنے آیا۔ نریندر بابو نے بغیر قصور کے اسے چانٹا رسید کیا ہے۔"

بندو نے جھنجلا کر کہا "جیجی سے کہہ جا کر۔"

عدالت سے لوٹنے کے بعد مادھو کپڑے بدلتے ہوئے کچھ مذاق کرنے چلے تھے کہ ڈانٹ سن کر چپ رہ گئے۔ نگاہوں سے پوشیدہ کتنے گھنے بادل منڈلا رہے ہیں اس گھر میں صرف انپورنا ہی اسے نہ سمجھ سکی۔ اضطراب میں ساری شام تڑپتے رہ کر موقع سے اکیلے میں پا کر اس نے چھوٹی بہو کا ہاتھ پکڑ کر منت آمیز لہجے میں کہا "ہزار ہو۔ وہ ہے تو تیرا ہی لڑکا۔ اب کی بار تو اسے معاف کر دے بلکہ تنہائی میں بلا کر اسے ڈانٹ ڈپٹ دے۔"

بندو نے کہا۔ وہ میرا لڑکا نہیں ہے۔ اس بات کو میں بھی جانتی ہوں تم بھی جانتی ہو۔ پھر جھوٹ موٹ بات بنانے کی کیا ضرورت ہے جیجی!"

انپورنا نے کہا "میں نہیں تو ہی اس کی ماں ہے۔ میں نے تجھے دے جو دیا ہے اسے۔"

"جب چھوٹا تھا کھلایا پلایا۔ اب وہ بڑا ہو گیا ہے تم اپنا لڑکا لے لو

اور مجھے نجات دو" کہہ کر بندو چلی گئی۔

رات کو روتی صورت بنا کر امول انپورنا کے پاس سونے آیا۔

انپورنا نے سارا معاملہ سمجھ کر جھنجلا کر کہا۔ یہاں کیوں آیا؟ یہاں سے ابھی جا، میں کہتی ہوں"

امول نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے باپ سو رہے ہیں۔ وہ کوئی بات کہے بغیر ہی آہستہ سے چلا گیا۔

کدم سویرے رسوئی گھر میں جوٹھے برتن اٹھانے گئی۔ تو دیکھا ٹلا برآمدے کے ایک کونے میں لکڑی اور کنڈوں پر پڑا سو رہا ہے وہ دوڑی ہوئی گئی اور بندو کو بلا لائی۔ انپورنا بھی بستر سے اٹھ کر باہر آ رہی تھی وہ بھی پاس آ کر کھڑی ہوئی

بندو نے تیز آواز میں کہا "رات کو جیٹھانی جی نے ڈانٹ دیا ہوگا اس کے رہنے سے ان کی نیند میں خلل جو پڑتا ہے۔ کیوں نا!"

لڑکے کی حالت دیکھ کر رنج اور افسوس سے اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈے آ رہے تھے۔ لیکن بندو کے سنگدلانہ طرزِ عمل سے وہ جل بھن گئی۔ بولی "تو ہمیشہ اپنے قصور کو دوسروں کے سر منڈھ کر خوش ہوتی ہے۔

بندو ٹلا کو اٹھانے چلی تو دیکھا۔ اس کا بدن گرم ہے، بخار آ گیا ہے۔ بولی "رات بھر کنوار کاتک کی اوس میں پڑا رہے گا۔ بخار تو آئیگا ہی۔ اب اچھا ہو جائے تو جان میں جان آئے"

انپورنا نے بیقراری کے ساتھ جھک کر کہا "بخار آ گیا کہاں دیکھوں؟"

بندو نے جھٹکے سے اسکا ہاتھ ہٹا کر کہا "بس اب دیکھنے کی ضرورت نہیں"۔

یہ کہہ کر سوتے ہوئے لڑکے کو احتیاط سے گود میں اٹھا کر اور انپورنا

کی طرف ایک بار زہر آلودہ نگاہ پھینک کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پانچ ہی چھ روز میں امول اچھا ہو گیا۔ لیکن جیٹھانی کے قصور کو بندو نے معاف نہیں کیا۔ اسی روز سے اس نے اس سے اچھی طرح بولنا تک بند کر دیا۔ اپورنا دل ہی دل میں سب کچھ سمجھ گئی۔ لیکن پھر بھی خاموش رہی۔ اس بے انصافی کو کہ سب کے سامنے بندو نے سارا قصور اسی کے سر منڈھ دیا۔ وہ کبھی بھول نہ سکی۔ اس بات کو ایک روز نہ جانے کس گفتگو کے سلسلے میں اس نے ایلوکیشی سے کہہ دیا "اسے بخار تو چھوٹی بہو ہی کی وجہ سے آیا تھا یہی اسکی خوش قسمتی ہے کہ مرا نہیں"

ایلوکیشی نے اس بات کو بندو سے کہنے میں ذرا بھی دیر نہ کی۔ بندو نے جی لگا کر سنا۔ لیکن کچھ نہ کہا۔ اس بات کو بھی اس نے سن لیا ہے۔ ایلوکیشی کے سوا اور کسی نے نہ جانا۔ بندو نے جیٹھانی سے بولنا قطعی بند کر دیا

بہت دنوں سے نئے مکان میں چیزیں بھیجی جا رہی تھیں۔ کل صبح ہی نئے مکان میں چلا جانا ہوگا۔ یادو بچوں کو لے کر اس مکان میں تھے اور مادھو مقدمے کے کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔ یہاں وہ بھی نہ تھے اتنے میں یہاں (یعنی پرانے مکان میں) ایک بہت بڑا واقعہ ہو گیا۔

شام کو ماسٹر پڑھانے آئے تھے۔ نہ جانے کیا سوچ کر بندو نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ کہا "کل سے اس مکان میں جا کر للا کو پڑھائیے گا" ماسٹر جی "حکم" کہہ کر چلنے لگا۔ تو بندو نے پھر پوچھا "آپ کا شاگرد آج کل کیسا پڑھتا ہے؟"

ماسٹر نے کہا "پڑھنے لکھنے میں تو برابر اچھا رہا ہے ہر سال اول آتا رہا ہے"

بندو نے کہا "وہ تو آتا ہی ہے لیکن آجکل چرٹ پینا جو سیکھ گیا ہے۔

دوسرے ہی لمحہ وہ خود ہی بولی "کچھ تعجب نہیں۔ لڑکے دیکھا دیکھی سب کچھ سیکھ جایا کرتے ہیں۔
ماسٹر چپ رہا۔ بندو نے کہا "اس کے باپ سے یہ بات کہہ دیجئے گا"
ماسٹر نے سر ہلا کر کہا "ہاں دیکھئے نا۔ پانچ سات دن پہلے کی بات ہے۔ اس دن لڑکوں نے اسکول کے راستے میں ایک ادھیا مالی کے باغیچے میں گھس کر اس کی بے وقت کی کچی امبیاں توڑ توڑ کر پیڑ پودے اکھیڑ اکھیڑ کر اور اسے مار پیٹ کر ایک طوفان کھڑا کر دیا"
بندو سانس روکے ہوئے بولی۔ "پھر؟"
"مالی نے جا کر ہیڈ ماسٹر سے کہہ دیا۔ انہوں نے اسے دس روپیہ جرمانہ دیا۔ تو کہیں جا کر وہ ٹھنڈا پڑا۔
بندو کو اس بات پر یقین نہ آیا۔ بولی "ہما للّٰہ ابھی تھا تو روپے اسے ملے کہاں سے؟"
ماسٹر نے کہا "یہ نہیں معلوم، مگر تھا وہ بھی، آپ کے نریندر بابو بھی تھے۔ اسکول کے اور بھی تین چار بدمعاش لڑکے تھے۔ میں نے یہ بات ہیڈ ماسٹر صاحب کی زبانی سنی ہے"
بندو نے کہا۔ روپئے بھی وصول ہو گئے؟"
جی ہاں یہ بھی سنا ہے"
"اچھا آپ جائیے" کہہ کر بندو وہیں بیٹھی رہی۔ اس کی زبان سے آہستہ آواز میں صرف اتنا نکلا "مجھے بغیر بتائے۔ اسے روپے دے دے اتنی ہمت اس گھر میں کس کی ہوئی"
ایک تو اس کی طبیعت ویسے ہی خراب تھی۔ اس پر جیجی سے بول

چال بند تھی۔ اب اس خبر نے ایسے نفع و ضرر کے سمجھنے کے قابل نہ رکھا وہ اٹھ کر رسوئی کے گھر میں گھس گئی۔ انپورنا رات کے لئے ترکاری پکا رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر چھوٹی بہو کے بادل گھرے چہرے کی طرف دیکھا

بندو نے پوچھا "جیجی! تم نے ادھر کسی دن للا کو روپے دئے تھے!"

انپورنا کو بالکل اسی بات کا اندیشہ تھا۔ ڈر سے اس کا گلا خشک ہو گیا۔ وہ نرمی سے بولی۔ "کس نے کہا؟"

بندو نے کہا "یہ ضروری بات نہیں۔ ضروری بات یہ ہے کہ اس نے کیا کہہ کر لئے اور تم نے کیا سمجھ کر دیئے؟"

انپورنا خاموش رہی۔

بندو نے کہا "تم نہیں چاہتیں کہ میں اس پر سختی کروں۔ اسی لئے تم نے مجھ سے چھپایا۔ للا اور چاہے جو کچھ کرے لیکن بڑوں کے سامنے جھوٹ نہیں بولے گا۔ یہ سچ ہے یا نہیں کہ تم نے جان بوجھ کر دئے ہیں؟"

انپورنا نے آہستہ سے کہا۔ "سچ ہے۔ مگر اب کی بار اسے معاف کر بہین۔ میں معافی مانگتی ہوں۔"

بندو کے سینے کے اندر آگ سی بھڑک رہی تھی۔ اس نے کہا "صرف اب کی بار معاف کروں! انہیں آج سے ہمیشہ کے لئے معاف کرتی ہوں اب کبھی نہ کہوں گی۔ اب بات بھی نہ کروں گی۔ میں یہ نہیں برداشت کر سکتی کہ وہ اس طرح تھوڑا تھوڑا کر کے آنکھوں کے سامنے جہنم کو جائے اس سے۔ تو یہ اچھا کہ بالکل ہی چلا جائے لیکن تمہاری اتنی ہمت!

آخری بات انپورنا کو بڑی تیزی سے چبھ گئی۔ پھر بھی وہ خاموش بیٹھی رہی۔ مگر بندو جتنا زیادہ بول رہی تھی۔ اتنا ہی اس کا غصہ بھی

بتدریج بڑھتا جاتا تھا۔ اس نے چلّا کر کہا "ہر بات میں تم بچی بن کر کہہ دیتی ہو۔ اب کی بار معاف کر۔ لیکن اس کا قصور اتنا نہیں جتنا تمہارا ہے۔ میں تمہیں نہیں معاف کروں گی"

گھر کے نوکر اور نوکرانیاں بھی اوٹ میں کھڑی سُن رہی تھیں۔

اینورنا سے اب برداشت نہ ہو سکا۔ اس نے کہا "کیا کریگی! پھانسی چڑھا دے گی!

آگ میں گھی پڑ گیا۔ بندو بارود کی طرح جل کر بولی۔ وہی تمہارے لئے ٹھیک سزا ہے۔

"یہی تو قصور کیا کہ اپنے لڑکے کو دو روپے دے دئے"

"کس بات میں کیا بات آپڑی۔ بندو اصل بات کو بھول کر کہہ بیٹھی۔

"کیوں دو گی! بگاڑنے کے لئے روپے آئے کہاں سے!"

اینورنا نے کہا۔ تو روپے نہیں بگاڑتی؟

"میں بگاڑتی ہوں تو اپنے روپے بگاڑتی ہوں۔ لیکن تم ذرا بتاؤ تم کس کے بگاڑتی ہو!"

اب اینورنا کو بہت زور سے غصّہ آگیا۔ وہ غریب گھر کی لڑکی تھی اس لئے اس نے سمجھا۔ بندو کا اشارہ اس طرف ہے۔ فوراً کھڑی ہو کر بولی "میں نے مانا تو بہت بڑے آدمی کی لڑکی ہے۔ لیکن اس بات پر تو اتنا غرور نہ کر کہ اور کوئی دوسرا دو روپے بھی نہ دے"

بندو بولی "میں ایسا غرور نہ کرتی۔ لیکن ذرا تم بھی غور کر کے دیکھو تم اگر ایک پیسہ بھی دیتی ہو تو کس کا دیتی ہو؟

اینورنا چلا اٹھی "کس کا پیسہ دیتی ہو۔ تیرے منہ میں جو آتا ہے

وہی کہہ دیتی ہے۔ جا دور ہو جا میرے سامنے سے"۔

بندو نے کہا۔ دور تو میں رات گذرتے ہی ہو جاؤں گی لیکن کس کا پیسہ خرچ کرتی ہو۔ یہ نہیں سوجھائی دیتا، کس کی کمائی سے کھاتی پیتی ہو۔ نہیں جانتیں؟

بات کہہ ڈالنے کے بعد بندو یکایک خاموش ہو گئی۔

انپورنا کا چہرہ فق پڑ گیا تھا۔ اس نے ایک لمحہ بعد چھوٹی بہو کے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ تمہارے شوہر کی کمائی کھاتی ہوں۔ میں تمہاری داسی ہوں۔ باندی ہوں۔ وہ تمہارے نوکر چاکر ہیں۔ یہی تو کہنا چاہتی ہے نہ! تو اتنے دنوں سے کیوں نہیں بتایا!"

انپورنا کے ہونٹ کانپ اٹھے۔ اس نے دانتوں تلے ہونٹ دبا کر کچھ دیر خاموش رہ کر کہا۔ اس وقت تو کہاں تھی چھوٹی بہو۔ جب چھوٹے بھائی کو پڑھانے کے لئے انہوں نے کبھی دو دھوتی ایک ساتھ خرید کر نہیں پہنی! کہاں تھی تو جب گھر جل جانے پر پیڑ کے نیچے ایک وقت کھا کر انہوں نے اس خاندانی مکان کو کھڑا کیا تھا،" کہتے کہتے اس کی دونوں آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے انہیں آنچل سے خشک کر کے وہ پھر بولی "اگر انہیں تم لوگوں کے دل کی بات معلوم ہوتی۔ تو وہ کبھی اس طرح افیم چڑھا کر آنکھیں بند کئے حقے کی نلی منہ سے لگائے آرام سے دن نہ گذارتے۔ وہ ایسے آدمی نہیں ہیں۔ انہیں تیرے مالک پہچانتے ہیں۔ انہیں جانتے ہیں۔ سورگ کے دیوتا... آج میرے بہانے تو نے ان کی توہین کی!"

شوہر کے فخر سے انپورنا کی چھاتی پھول اٹھی۔ بولی "اچھا ہی

ہوا جو جتا دیا. ستی نے خود کشی کی تھی۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ کسی کے گھر رسوئی بنا کر پیٹ پال لوں گی۔ لیکن تیرا کھانا اب نہ کھاؤں گی تو نے کیا کیا ان کی توہین کی۔؟"

ٹھیک اسی وقت یادو آکر آنگن میں کھڑے ہو گئے بولے بڑی بہو شوہر کی آواز سن کر اس کا غرور خودداری طوفان خیز سمندر کی طرح اچھل اٹھا۔ وہ دوڑی ہوئی باہر آ کر بولی۔ "چھی چھی، جو آدمی اپنے بیوی بچے کو کھلا پلا نہیں سکتا۔ اس کو گلے میں پھانسی لگا کر مر جانے کے لئے رسّی تک نہیں ملتی؟"

یادو حیران ہو گئے۔ بولے کیا ہوا جی!"

"ہوا کیا؟ کچھ نہیں۔ چھوٹی بہو نے آج صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میں اس کی داسی ہوں اور تم اس کے نوکر ہو۔"

بندو نے کمرے کے اندر دانتوں تلے زبان دبا کر کانوں میں انگلی دے لی۔"

"بورنا نے روتے ہوئے کہا۔ تمہارے جیتے جی آج مجھے یہ بات سننی پڑی۔ کہ مجھے ایک پیسہ بھی کسی کو ہاتھ سے اٹھا کر دینے کا حق نہیں۔ آج تمہارے سامنے کھڑی ہو کر میں یہ سوگند لیتی ہوں کہ ان لوگوں کا اناج کھانے کے پہلے مجھے اپنے بیٹے کا سر کھانا پڑے۔"

بندو کے رکے ہوئے کانوں میں یہ بات پہنچ ہی گئی اس نے آہستہ سے کہا۔ یہ کیا کیا جیجی تم نے؟" اور وہیں کی وہیں گردن جھکا کر آج بارہ برس بعد وہ یکایک بیہوش ہو کر گر پڑی۔"

× × × ×

(۷)

نئے مکان میں یادو انپورنا اور راموں کے سوا اور سب لوگ آ گئے تھے۔ باہر سے بندو کی بُوا۔ بُوا کی لڑکی۔ ناتی نتنی میکے سے اس کے ماں باپ اور ان کے نوکر چاکر اور نوکرانیوں کے آجانے سے گھر بھر گیا تھا یہاں آنے ہی کے دن بندو کچھ اداس نظر آئی تھی۔ لیکن اس کے دوسرے ہی روز سے اس کا یہ انداز دور ہو گیا تھا بندو کو اس میں ذرا شک نہ تھا۔ کہ غصہ اترتے ہی انپورنا آئے گی۔ وہ پوجا کر کے لوگوں کو کھلانے پلانے کے انتظام میں مشغول ہو گئی۔

بندو کے باپ نے پوچھا ”بیٹا۔ تیرا لالہ کیوں نہیں دکھائی دیتا؟
بندو نے اختصار کے ساتھ کہا۔ وہ اس گھر ہے“
ماں نے پوچھا ”شائد تیری جیٹھانی نہ آسکی؟
بندو نے کہا ”نہیں“

توانہوں نے خود ہی کہا ”سب لوگ آجائیں گے تو اس مکان میں کون رہے گا۔ خاندانی مکان کو بند بھی تو نہیں رکھا جاسکتا“
بندو نے کچھ نہ کہا وہ اپنے کام میں لگ گئی۔

یادو ان دنوں روز شام کو ایک بار آکر باہر بیٹھ جایا کرتے تھے اور بات چیت کرنے کے بعد خیر خیریت دریافت کر کے واپس چلے جایا کرتے تھے۔ مگر اندر نہ گھستے تھے۔ گھر کی پوجا کے ایک دن پہلے رات کو وہ اندر گھس کر ایلوکیشی کو بلا کر خیریت دریافت کر رہے تھے۔ بندو کو جیسے ہی معلوم ہوا۔ وہ اوٹ میں کھڑی ہو کر سب سننے لگی۔ باپ سے بھی زیادہ اپنے اس جیٹھ سے بچپن سے آج تک اسے کتنا لاڈ پیار ملا

ہے۔ کتنی محبت کی پکاریں سنی ہیں! یادو "بہورانی" کہہ کر بلاتے تھے انہوں نے کسی دن "چھوٹی بہو" تک نہیں کہا۔ اس نے جٹھانی سے بگاڑ کر کے اپنے انہیں جیٹھ جی سے کتنی ہی شکائتیں کی ہیں اور اس کی کوئی بھی شکایت کسی دن ناقابل اعتنا نہیں ہوئی۔ آج ان کے سامنے بیحد شرم سے بندو کا گلا بھر آیا، یادو چلے گئے۔ وہ تنہا کمرے میں جاکر منہ میں آنچل ٹھونس کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ چاروں طرف کہیں کوئی سن نہ لے۔

دوسرے روز صبح کے وقت بندو نے اپنے شوہر کو بلا کر کہا "دیر ہوتی جارہی ہے پروہت جی بیٹھے ہوئے ہیں مگر جیٹھ جی ابھی تک نہیں آئے"

مادھو نے حیران ہو کر پوچھا "وہ کیوں آئیں گے؟"

بندو نے اس سے بھی زیادہ حیران ہو کر کہا "وہ کیوں آئیں گے؟ تو ان کے سوا یہ سب کرے گا کون؟"

مادھو نے کہا۔ میں یا چچا جی پر یہ بابو کریں گے۔ بھیّا نہ آسکیں گے۔"

بندو نے غصہ ہو کر کہا "نہ آسکیں گے۔ کہنے ہی سے سب کام بن جائے گا! ان کے رہتے ہوئے کیا اور کسی کا اختیار ہے کرنے کا! انہیں کہیں ایسا نہیں ہوگا۔ ان کے سوا میں کسی اور کو کچھ نہ کرنے دوں گی۔"

مادھو نے کہا "تو سب بند رہنے دو۔ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ کام پر گئے ہیں!"

یہ سب بڑی مالکن کی کارستانی ہے۔ تو پھر معلوم ہوتا ہے۔ وہ بھی نہ آئیں گی کہہ کر بندو ردفی سی صورت بنائے چلی گئی۔ اس کے لئے پوجا پاٹ۔ جشن تقریب دعوت و تواضع سب کچھ بیک لمحہ ضائع ہوگیا۔ تین

دن سے وہ ہر وقت یہی سوچ رہی تھی کہ آج جیٹھ جی آئیں گے۔

جیجی آئیں گی للا بھی آئے گا یہ بات اس کے سوا اور کوئی بھی نہ جانتا تھا کہ آج کے سارے دن بھر کے کام کاج پر وہ دل ہی دل میں اپنا سب کچھ مطمئن ہو کر بیٹھی تھی۔

ایا تو کیشی نے آکر کہا "ذرا بھنڈار کی کنجی تو دینا چھوٹی بہو، حلوائی سندیش (ایک قسم کی عمدہ مٹھائی) لے کر آیا ہے"

بندو نے افسردہ لہجے میں کہا "ابھی وہیں رکھوا لو بی جی! بعد میں دیکھا جائے گا"

"کہاں رکھواؤں بہو۔ کوے وغیرہ منہ لگائیں گے"

"تو پھینکوا دو" کہہ کر بندو دوسری طرف چلی گئی۔

تو بوا جی نے آکر کہا "کیوں بندو۔ اس وقت کتنا آٹا گندھوایا جائے ذرا بتا دیتیں"

بندو نے منہ بھاری کر کے کہا۔ میں کیا جانوں کتنا گندھواؤ گی؟ تم سب بڑی بہو ہو۔ تم نہیں جانتیں!"

بوا جی نے دنگ رہ کر کہا۔ سن لو اس کی بات۔ میں کیا جانوں کتنے آدمی اس وقت کھائیں گے"

بندو نے غصے میں کہا "تو پوچھو ان سے جا کر اس بار جیجی کہتیں" للا کے جنیو میں تین دن تک شہر کے سب لوگوں نے کھایا پیا۔ مگر انہوں نے ایک بار بھی مجھ سے پوچھا کہ چھوٹی بہو فلاں کام کر یا فلاں چیز دیکھ جا کر" یہ کہتی ہوئی وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کدم نے آکر پوچھا "جیجی داماد بابو نے کہا ہے کہ پوجا کے کپڑے تھے..."

اس کی بات ختم ہونے کے پہلے ہی بندو چلا اٹھی "کھا ڈالو مجھے۔ تم سب مل کر کھا ڈالو مجھے، جا دور ہو میرے سامنے سے!"

کدم گھبرا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

کچھ دیر بعد مادھو نے آکر کٹی بار آکر کہا۔ کہاں گئیں، سنتی ہو!

بندو پاس آکر بگڑ کر بولی۔ نہیں ہوتا مجھ سے۔ میں نہیں کر سکونگی نہیں کر سکوں گی۔ ہوا اب؟"

مادھو دنگ ہو کر اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگے

بندو نے کہا۔ کیا کر لو گے میرا؟ پھانسی دو گے! تو دے دو پھانسی ہی"۔ کہہ کر روتی ہوئی وہ جلدی سے وہاں سے چلی گئی ادھر دن چڑھنے لگا۔ بندو بغیر کام کے چھٹپٹاتی ہوئی ادھر سے ادھر ہر کمرے میں جا کر لوگوں کی غلطیاں پکڑتی پھرنے لگیں۔ کسی نے جلدی میں راستے پر کچھ برتن رکھ دئے تھے۔ بندو نے انہیں گھسیٹ کر آنگن میں پھینک دیا۔ اور کس طرح کام کیا جاتا ہے۔ سکھا دیا۔ کس کی بھیگی دھوتی سوکھ رہی تھی جو اڑ کر اس سے چھو گئی۔ بس بندو نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ اور اس طرح سمجھا دیا کہ دھوتی کیسے خشک کی جاتی ہے۔ جو کوئی اس کے سامنے پڑتا۔ وہی ڈر کے مارے سامنے سے ہٹ کر ایک کنارے کھڑا ہو جاتا۔

پروہت بیچارے نے خود اندر آکر کہا۔ بڑی مشکل ہے دیر ہوتی جا رہی ہے۔ مگر کوئی انتظام ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔"

بندو نے اوٹ میں کھڑے رہ کر سخت جواب دیا۔ "کام کاج کے گھر میں تھوڑی بہت دیر ہوتی ہی ہے۔" کہہ کر ایک برتن کو پاؤں

سے دور ٹھکرا کر دوسرے کمرے میں جا کر وہ بے جان کی طرح زمین پر پڑی رہی۔ دس منٹ بعد یکایک اس کے کانوں میں ایک آشنا آواز سنائی دی۔ وہ کھڑبڑا کھڑی ہو گئی اور دروازے سے منہ بڑھا کر دیکھا اپنورنا آ کر آنگن میں کھڑی تھی۔ بندو رنج اور غم کے باعث روتی آنکھیں خشک کر کے گلے میں آنچل ڈال کر ہاتھ جوڑ کر اپنی جیٹھانی سے بولی "دس گیارہ بج رہے ہیں اب اور کتنی دشمنی نبھاؤ گی جیجی؟ میرے زہر کھا لینے پر تمہاری منشا پوری ہو جائے تو وہی کرو گھر جا کر ایک کٹوری میں بھیج دو" کہہ کر اس نے چابی کا گچھا جھن سے جیٹھانی کے پیروں کے پاس پھینک دیا اور خود اپنے کمرے میں چلی گئی اور اندر سے کواڑ بند کر کے زمین پر اوندھے منہ پڑ کر رونے لگی۔

اپنورنا نے چپ چاپ چابیوں کا گچھا اٹھایا۔ کواڑ کھولے۔ اور بھنڈار گھر میں داخل ہو گئی۔

تیسرے پہر لوگوں کے آنے جانے اور لوگوں کے کھلانے پلانے کی بھیڑ کم ہو گئی تھی۔ پھر بھی بندو نہ جانے کس بات کے لئے پریشان ہو کر کبھی اندر اور کبھی باہر جانے آنے لگی۔

بھیرو نے آکر کہا "للّا بابو اسکول میں نہیں ہیں"

بندو نے اس پر آنکھوں سے آگ برساتے ہوئے کہا "اچھا گا کہیں کا۔ لڑکے رات تک اسکول میں رہتے ہوں گے؟ نیا آدمی ہے تو ایک بار اس گھر جا کر کیوں نہیں دیکھ آیا؟

بھیرو نے کہا "اس گھر بھی نہیں ہیں"

بندو نے چلا کر کہا "تو کہیں کسی نیچ ذات کے لڑکوں کے ساتھ

گلی ڈنڈا کھیل رہا ہوگا۔ اب اس کے من میں کسی بات کا ڈر تو ہے نہیں! اب کی بار جب ایک آنکھ پھوٹ جائے گی تو جاکر بڑی مالکن کا کلیجہ ٹھنڈا ہوگا۔ تو جا۔ جہاں ملے، اسے ڈھونڈھ کر لا۔"

انپورنا بھنڈار گھر کی چوکھٹ پر بیٹھیں اور دس پانچ دوسری بڑی بوڑھیوں کے ساتھ بات چیت کر رہی تھیں۔ چھوٹی بہو کی تیز آواز انہوں نے سن لی۔ گھنٹے بھر بعد بھیرو نے آکر کہا۔ "للا بابو گھر ہی پر ہیں۔ مگر آتے نہیں۔"

بندو کو اس بات پر یقین نہ آیا۔

"نہیں آتا ہے کیا رے! تو نے کہا تھا۔ اس سے میں بلا رہی ہوں!"

بھیرو نے گردن جھکا کر کہا۔ "ہاں۔ پھر بھی نہیں آئے!"

کچھ دیر چپ رہ کر بندو نے پھر کہا۔ "اس کا کیا قصور؟ جیسی ماں ہے ویسا ہی تو لڑکا ہوگا۔ میں بھی سخت سے سخت قسم کھا کر کہتی ہوں ایسے ماں بیٹے کا منہ نہ دیکھوں گی۔"

بہت رات گئے انپورنا جب اپنے گھر جانے کے لئے تیار ہوئی تو مادھو خود انہیں پہنچانے کے لئے آئے۔ بندو نے جلدی سے پاس آکر اپنے شوہر سے تیز لہجے میں کہا۔ "پہنچانے تو چلے ہو۔ جانتے ہو انہوں نے پانی تک نہیں پیا ہے۔"

مادھو نے کہا۔ "وہ تو تمہارے جاننے کی بات ہے میرے نہیں سب کام بگڑتا ہوا دکھائی دیا تو خود جا کر لایا تھا اب خود ہی پہنچانے جا رہا ہوں۔

بندو نے کہا۔ "اچھا اچھا اچھی بات ہے۔ میں دیکھتی ہوں تم بھی اسی طرف ہو

مادھونے اس کا کوئی جواب دئے بغیر اپنی بھابھی سے کہا۔"چلو بھابھی اب دیر نہ کرو۔"

"چلو لالہ جی" کہہ کر انپورنا نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ بندو نے گرج کر کہا۔"لوگ مثل کہتے ہیں نہ۔ گھر کا دشمن! منہ میں جو کچھ بات آئی وہ دس پانچ جھوٹی سچی ملا کر کہہ دی۔ دانت پیس کر قسمیں کھالئیں۔ چار دن چار رات لڑکے کا منہ تک نہ دیکھنے دیا۔ بھگوان ہی اس کا انصاف کرینگے۔"

کہتی ہوئی بندو اپنے منہ میں آنچل ٹھونس کر کسی طرح رلائی روکتی ہوئی رسوئی گھر میں جا کر الٹے منہ پڑ رہی اور ساتھ ہی بیہوش ہو گئی۔ شور و غل مچ گیا۔ مادھو اور انپورنا دونوں نے سنا۔ انپورنا نے گھوم کر رکتے ہوئے کہا۔ کیا ہوا دیکھوں؟"

مادھو نے کہا۔"دیکھنے کی ضرورت نہیں چلو۔"

ادھر کئی دنوں سے جھگڑے کی بات پوشیدہ تھی۔ مگر اب نہ رہ سکی۔ دوسرے روز جب گھر کی عورتیں ایک جگہ بیٹھیں تو ایلوکیشی نے کہا۔ دیورانی، جیٹھانی ہیں تو جھگڑا ہی ہوا ہے۔ لیکن لڑکے کو کیا ہو گیا جو وہ ایک بار بھی نہیں آسکا۔ چھوٹی بہو نے کچھ جھوٹ نہیں کہا۔ جیسی ماں ہیں ویسا ہی تو لڑکا ہو گا۔ بہت بہت لڑکے دیکھے ہیں بھین۔ لیکن۔ ایسا نمک حرام کہیں نہیں دیکھا۔"

بندو نے افسردہ نظر سے ایک بار اس کی طرف دیکھ کر شرم اور نفرت کے باعث آنکھیں نیچی کر لیں۔ ایلوکیشی نے پھر کہا۔"تمہیں لڑکا چاہیے چھوٹی بہو۔ میرے نریندر ناتھ کو لے لے۔ اسے تمہیں دئے دیتی ہوں۔ مار ڈالو۔ کاٹ ڈالو۔ کسی روز دو ایک بات بھی کہلانے

والا لڑکا نہیں۔ میں نے ویسی اولاد پیٹ میں نہیں رکھی:

بندو چپ چاپ خاموش بیٹھی رہی۔ بندو کی ماں کی عمر ہو چکی ہے
میندار کے گھر کی لڑکی ہے اور زمیندار ہی کے گھر کی بیوی نہایت
ربہ کار اور زمانہ شناس تھیں۔ وہ ہنس کر بولیں "یہ کیسی بات کہہ رہی
جی۔ اصول اس کے گوشت اور ہڈی میں بسا ہوا ہے۔ نہیں نہیں
ے تم لوگ پریشان نہ کرو۔ بندو تمہارا جھگڑا تو دو دن سے ہے
ا۔ کیا اس سے لڑکا پرایا ہو جائے گا۔

بندو چھلکتی ہوئی آنکھوں سے ماں کے چہرے کی طرف دیکھ
پ چاپ بیٹھی رہی۔

شام کے وقت اس نے کدم کو بلا کر کہا "اچھا کدم تو تو موجود
۔ بتا میرا اتنا کیا قصور تھا۔ جو وہ اتنی کڑی قسم کھا بیٹھیں؟"
کدم کو یکایک اس بات پہ یقین نہ آیا۔ کہ بندو نے اسے اس
پر ثبوت کے لئے بلایا ہے۔ وہ نہایت سمٹی ہوئی سی خاموش
ی رہی۔ پھر بھی بندو نے کہا "نہیں نہیں ہزار ہو تم تمہیں بڑی
تم لوگوں کی دو باتیں مجھے سننی ہی چاہئیں، تو ہی بتا نہ، مجھ سے
قصور ہوا تھا؟"

کدم نے گردن ہلا کر کہا۔ نہیں جیجی۔ قصور کی کیا بات ہے؟"
بندو نے کہا "تو جیا نہ، ذرا اس گھر۔ دو چار باتیں اچھی طرح سنا
جا کر۔ تجھے ڈر کس بات کا ہے!"

کدم ہمت پا کر بولی "ڈر کچھ نہیں جیجی۔ لیکن ضرورت کیا ہے
جھگڑا لڑائی بڑھانے کی؟ جو ہونا تھا وہ ہو گیا"

بندو نے کہا "نہیں نہیں کدم تو سمجھتی نہیں۔ سچ بات کہہ دینا
ہے۔ نہیں۔ تو وہ سمجھیں گے کہ سب قصور میرا ہی ہے۔ ان کا کچھ
نہیں۔ نکال دوں گی دور کر دوں گی۔ کیا یہ سب باتیں نہیں کہیں ا
نے! لیکن میں کسی دن اس پر غصہ ہوئی ہوں؟ کیوں انہوں
چھپا کر روپے دیئے؟ کیوں مجھے نہیں بتایا؟"

کدم نے کہا "اچھا کل جاؤں گی۔ آج شام ہو گئی ہے۔"

بندو ناخوش ہو کر بولی "شام کہاں ہو گئی کدم۔ تو بات بہ
کاٹا کرتی ہے۔ جاڑے کے دن ہیں۔ اسی سے ایسا دکھائی دیتا
نہ ہو تو کسی کو ساتھ لیتی جا۔ ارے او بھیرو۔ سن۔ ذرا ہیوا کو بلا د
تو۔ کدم کے ساتھ چلا جائے۔"

بھیرو نے کہا۔ ہیوا سے بابو جی بنتی صاف کرا رہے ہیں۔"

بندو نے آنکھ اٹھا کر کہا "پھر تو لنے منہ کے سامنے جواب د
بھیرو داس غضب ناک آنکھوں کی تاب نہ لا کر بھاگ گھڑ
کدم کو بھیج کر بندو وہ ایک بار اس کمرے سے اس کمرے میں جا کر
گھر میں جا پہنچی۔ مصرانی اکیلی بیٹھی پکا رہی تھی۔ بندو نے ایک
بیٹھ کر کہا "اچھا مصرانی جی، تمہیں کو پنچ مانتی ہوں، سچ بات بتا
کا قصور زیادہ ہے؟"

مصرانی سمجھ نہ سکی۔ بولی "کیا قصور بہو جی؟"

بندو نے کہا "اس روز کی بات ہے جی۔ کیا کہا تھا۔ میں
صرف اتنا ہی نہ پوچھا تھا۔ کہ جیجی للا کو اس درمیان میں روپے
ہیں؟ کون نہیں جانتا کہ لڑکوں کے ہاتھ میں روپے پیسے نہ

چاہئیں۔ یہ کہہ دینے ہی سے تو معاملہ ختم ہو جاتا کہ بہت رو دھو رہا تھا اس لئے دے دیئے۔ بس جھگڑا طے تھا۔ اس بات پر اتنی فضول گوئی کرنے کی کیا ضرورت تھی اور ایسی قسم کیوں کھائی گئی؟

جہاں دس برتن ہوتے ہیں۔ وہاں کھٹ پٹ تو ہوا ہی کرتی ہے پھر ہم تو آدمی ٹھہرے کہیں ایسی بات پر اتنی بڑی قسم کھائی جاتی ہے گھر میں ایک ہی لڑکا ہے۔ اس کے نام پر قسم! میں تم سے کہتی ہوں مصرانی، میں اس جنم میں اس کا منہ نہ دیکھوں گی۔ دشمن کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ لوں گی لیکن ان کی طرف نہیں۔"

مصرانی فطرتاً کم سخن تھیں۔ وہ کیا کہتی، کچھ سمجھ میں نہ آیا اس لئے خاموش ہی رہی۔ بندو کی دونوں آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اس نے فوراً آنکھیں خشک کر کے گلوگیر آواز میں پھر کہا۔ غصے میں کون نہیں قسم کھا بیٹھتا مصرانی! تو کیا اس نے پانی تک نہ چھونا چاہیئے لڑکے تک کو نہ آنے دیا۔ کیا یہ سب بڑوں کے سے کام ہیں! ہزار ہو۔ میں چھوٹی ہوں۔ سمجھ کم ہے۔ اگر انہیں کے پیٹ کی لڑکی ہوتی تو پھر کیا کرتیں؟ میں بھی زبان پر ان کا نام نہ لاؤں گی، دیکھ لینا تم!"

مصرانی پھر بھی چپ رہی۔ بندو کہنے لگی اور وہی قسم کھانا جانتی ہیں۔ میں نہیں جانتی! کل اگر اس گھر جا کر کہہ آؤں۔ کٹورا بھر زہر نہ پلوا دو۔ تو تمہاری وہ قسم رہی۔ تو کیا ہو؟ میں دو چار دن چپ مارے بیٹھی ہوئی ہوں۔ اس کے بعد یا تو جا کر وہی قسم دے آؤں گی یا خود ہی زہر کا پیالہ پی کر کہہ جاؤں گی۔ جیجی نے بھیج دیا۔ دیکھوں پھر لوگ ان کے نام پر تھوکتے ہیں یا نہیں۔ ان کی عقل ٹھکانے آتی

ہے یا نہیں ؟"

مصرانی ڈر گئی وہ آہستہ سے بولی۔ چھی بہو جی۔ ایسی باتیں نہ
سوچنی چاہئیں۔ لڑائی جھگڑا ہمیشہ نہیں رہتی۔ وہ بھی تمہیں چھوڑ
نہیں رہ سکتیں اور نہ للّاہی تمہارے بغیر رہ سکتا ہے۔ ہم لوگ
صرف یہی سوچ کر حیران ہو رہی ہیں کہ وہ ان دنوں وہاں کیسے رہتا
بندو نے مضطرب ہو کر کہا "وہی تو کہتی ہوں مصرانی۔ یقیناً
نے اسے مار پیٹ اور ڈرا دھمکا کر رکھا ہے۔ بھلا جو لڑکا ایک رات
بھی میرے بغیر نہیں سو سکتا تھا۔ اسے آج پانچ دن اور چار راتیں
گذر گئیں۔ کیا ایسی عورت کا منہ دیکھنا چاہیئے؟ میں نے کہہ نہ دیا
کی طرف منہ اٹھا کر دیکھ لوں گی لیکن ان کی طرف تو اب اس جنم
نہیں دیکھ سکتی۔"

مصرانی جی نے اپنی کلائی کے پاس ایک کالا سا داغ دکھا
ہوئے کہا "یہ دیکھو بہو۔ ابھی تک داغ باقی ہے۔ اس روز رات
جب تم بیہوش ہو گئی تھیں۔ اس وقت کی بات تو تمہیں معلوم
نہیں۔ للّا نہ جانے کہاں سے آکر تمہارے سینے پر سے لپٹ گ
اس کا رونا اگر تم دیکھتیں تو نہ جانے کیا کہتیں۔ اس نے تو کبھی
نہیں کہ مرنا کیا ہوتا ہے۔ کہنے لگا "چھوٹی ماں مر گئی! نہ تو وہ مجھے
کے چھینٹے ڈالنے دیتے تھے۔ نہ پنکھا جھلنے دیتے تھے۔ میں نے چھین
اٹھانا چاہا۔ تو اس نے مجھے کاٹ کھایا۔ بڑی بہو نے پکڑ کر اٹھا
چاہا۔ انہیں بھی کاٹ کر نوچ کھسوٹ لیا۔ ان کی دھوتی کا آنچ
بھی پھاڑ ڈالا۔ لوگ بیمار کی خدمت کیا کریں بہو۔ اسی کو لے ک

مشکل میں پڑ گئے۔ آخر چار پانچ آدمی مل کر اسے اٹھا لے گئے۔
بندو پلک جھپکائے بغیر مہرانی کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوئی گویا اس کی باتوں کو جذب کرنے لگی۔ اس کے بعد ایک لمبی سانس لے کر آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں جا کر کواڑ بند کر کے پڑ رہی۔
چار روز بعد۔ بندو کے باپ ماں بوا وغیرہ کے واپس جانے کے ایک روز پہلے غشی دور ہو جانے پر بندو اپنے بستر پر پڑی تھی۔ کدم پنکھا جھل رہی تھی۔ اور کوئی نہ تھا۔ بندو نے اشارے سے اسے اور بھی پاس بلا کر آہستہ آواز میں کہا۔
"کدم جیجی آئی ہیں کیا رے!"
کدم نے کہا "نہیں جیجی۔ ہم لوگ تو خود ہی کافی ہیں۔ پھر انہیں تکلیف دینے کی کیا ضرورت!"
بندو نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا "یہی تو تم لوگوں میں خرابی ہے کدم۔ ہر کام میں تم لوگ اپنی عقل لگانا چاہتی ہو۔ معلوم ہوتا ہے اسی طرح کسی دن تم سب مجھے مار ڈالو گی پوجا کے دن بھی تو تم سب گھر بھر موجود تھیں۔ لیکن جب تک انہوں نے گھر میں قدم نہ رکھا۔ تب تک تم لوگ کیا کر سکیں۔ ارے کہاں تم لوگ اور کہاں وہ۔ ان کی کانی انگلی کے برابر بھی تم سب میں طاقت نہیں"
بندو کی ماں نے کمرے میں گھس کر کہا "جمائی (داماد) کی تو رائے ہے بندو، تو بھی کچھ دنوں کیلئے ہمارے ساتھ گھوم [illegible]"
بندو نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا "میرا جانا نہ جانا کیا انہیں کی رائے پر موقوف ہے۔ ماں جوان کے کہہ دینے سے

چلی جاؤں۔ میں اپنے دشمن کا حکم پائے بغیر کیسے جا سکتی ہوں!"
ماں بات کو سمجھ گئیں۔ بولیں۔ اپنی جیٹھانی کی بات کر رہی ہے تو؟ اب اس کے حکم کی ضرورت نہیں۔ جب تم سب الگ ہو کر چلے آئے ہو تو انہیں کا کہنا کافی ہے!"

بندو نے سر ہلا کر کہا" نہیں نہیں ایسا نہ ہو گا جب تک زندہ ہوں۔ اس وقت وہ چاہے جہاں رہیں۔ سب کچھ وہی ہیں۔ اور چاہے میں جو بھی کر دوں۔ لیکن ان کی اجازت کے بغیر میں گھر چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ نہیں جیٹھ جی غصہ ہوں گے۔

اسی وقت ایلوکیشی نے آ کر یہ سنا تو کہا" اچھا میں کہتی ہوں تم جاؤ!"

بندو نے اس کی بات کا جواب بھی نہ دیا۔ ماں نے کہا" اچھی بات ہے تو آدمی بھیج کر ان سے پوچھوا ہی لے تو۔

بندو نے حیران ہو کر کہا آدمی بھیج کر! یہ تو اور بھی برا ہو گا ماں! میں ان کے دل کو جانتی ہوں۔ وہ زبان سے کہہ دیں گی" چلی جا" مگر اندر ہی.. اندر غصہ رہیں گی اور شاید جیٹھ جی سے چار چھ جھوٹی سچی ملا کر کہہ دیں گی.. نہیں ماں۔ تم لوگ جاؤ میں نہ جا سکونگی

اس کے بعد ماں نے ضد نہیں کی۔ چلی گئیں۔

اب تو سنسان مکان کا ایک ایک لمحہ گوشہ اسے کھا جانے کے لئے منہ پھاڑنے لگا۔

نیچے کے ایک کمرے میں ایلوکیشی رہتی تھی۔ اور اوپر کا ایک کمرہ اس کا اپنا تھا۔ باقی سارے کمرے خالی پڑے تھے۔

وہ اداس دل سے گھومتی پھرتی سہ منزلے کے ایک کمرے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ کسی مستقبل بعید کی بہتر بہو کے لئے اس نے یہ کمرہ بنوایا تھا۔ اس میں آتے ہی وہ کسی طرح اپنے امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک نہ سکی۔ نیچے اتر رہی تھی کہ درمیان میں شوہر سے ملاقات ہوتے ہی وہ کانپ اٹھی۔ "کیوں جی۔ اب کیا ہو گا؟"

مادھو نہ سمجھ سکے بولے۔ "کس بات کا!"

اب بندو سے جواب نہ دیا گیا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولی "نہیں نہیں تم جاؤ۔ کوئی بات نہیں ہے۔"

دوسرے روز سویرے مادھو باہر والے کمرے میں بیٹھے کام کر رہے تھے۔ اچانک بندو نے گھر میں گھستے ہی اپنی رلائی کو دباتے ہوئے پوچھا۔ "جیٹھ جی نوکری کرنے لگے ہیں؟"

مادھو نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی کہا۔ "ہاں"

"ہاں کیا؟ کیا یہ ان کی نوکری کرنے کی عمر ہے!"

مادھو نے پہلے کی طرح کاغذات پر نگاہ رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا آدمی نوکری عمر کے لحاظ سے کرتا ہے! نوکری کرتا ہے۔ کمی کے سبب"

"تو انہیں کس بات کی کمی ہے! ہم ان کے بیگانے ہیں! لڑائی جھگڑا ہم دونوں میں ہوا ہے۔ مگر تم تو ان کے بھائی ہو!"

مادھو نے کہا۔ "سوتیلے بھائی ہیں۔ رشتے کے۔"

بندو حیران رہ گئی۔ آہستہ سے بولی۔ "تم اپنے جیتے جی انہیں نوکری کرنے دو گے؟"

مادھو نے ایک بار سر اٹھا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اس کے

بعد پرسکون فطری انداز میں کہا "کیوں نہ کرنے دوں گا؟"

دنیا میں سب اپنی اپنی تقدیر لے کر آتے ہیں۔ اور اس کے مطابق آرام تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اس کی زندہ مثال میں خود ہوں میں نہیں جانتا کب میرے باپ ماں کا انتقال ہوا۔ بھابھی کی زبانی میں نے سنا ہے۔ ہم لوگ بڑے غریب تھے مگر مجھے کبھی تکلیف ومصائب کی آنچ تک نہ لگی۔ مجھے کہاں سے ہمیشہ سفید کپڑے ملتے رہے۔ کہاں سے اسکول کالج کا خرچ، کتابوں کے دام۔ میس کا کرایہ وغیرہ آتا رہا۔ اسے میں اب بھی نہیں جانتا۔ اس کے بعد وکیل ہونے پر بھی کچھ کم روپے نہیں ملے۔

اتنے میں نہ جانے کیسے کہاں سے تم اپنے ساتھ ڈھیر کے ڈھیر روپے لائیں۔ اچھا مکان بھی بن گیا۔ مگر بھیا کو دیکھو۔ ہمیشہ چپ چاپ جان توڑ محنت کرتے رہے ہیں۔ پھٹے پرانے پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے رہتے ہیں۔ جاڑے کے دنوں میں بھی میں نے کبھی ان کے بدن پر گرم کپڑا نہیں دیکھا۔ وہ ایک وقت مٹھی بھر کھا کر صرف میرے لئے کام کرتے تھے۔ تمام باتیں مجھے یاد بھی نہیں آتیں اور یاد آنے کی ضرورت بھی تو نہیں۔ ابھی کچھ ہی روز چنداں آرام کرنے پائے تھے۔ کہ اب بھگوان مع سود کے وصول کئے لے رہا ہے" یہ کہکر وہ اچانک منہ پھیر کر کوئی ضروری کاغذ تلاش کرنے لگے۔

بندو ساکت ہو گئی۔ ان گذرے دنوں کی معمولی سرگذشت میں شوہر کی جانب سے اس کی کتنی بڑی تحقیر و توہین چھپی ہوئی تھی۔ بندو اپنے خون کے ایک ایک قطرے میں یہ بات محسوس

کرنے لگی۔ وہ سر جھکائے کھڑی رہی۔

مادھو کاغذ تلاش کرتے ہوئے گویا اپنے آپ ہی کہتے رہے نوکری بھی کیسی۔ رادھا پور کی کچہری تک آنے جانے میں تقریباً پانچ کوس کا چکر۔ صبح ہی چار بجے سے نکل کر دن بھر بغیر کھائے پیئے کرنا اور رات کو گھر آکر دو لقمہ کھانا۔ اس پر بارہ روپے تنخواہ!

بندو کانپ اٹھی۔ دن بھر بغیر کھائے پیئے اور کل بارہ روپے تنخواہ۔ ہاں بارہ روپے۔ عمر تمام ہو چکی۔ اس پر افیمی آدمی۔ تھوڑا سا دودھ بھی نہیں ملتا۔ دیکھتا ہوں۔ بھگوان اتنے دنوں بعد اب رحم کر کے بھیرا گئے درد کو دور کر دینے کی تدبیر کر رہے ہیں۔"

بندو کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے اور اس کے بعد جو اس نے کبھی نہیں کیا۔ وہ بھی کر ڈالا۔ اس نے جھک کر شوہر کے پیر پکڑ لئے۔ اور روتے ہوئے کہا "تمہارے پیروں پڑتی ہوں، کوئی تدبیر کرو۔ کمزور آدمی ہیں۔ اس طرح تو دو دن بھی نہ جی سکیں گے!"

مادھو نے کسی طرح اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ کر کہا۔ "میں کیا تدبیر کروں۔ بھابھی ہم لوگوں کا ایک دانہ اناج بھی نہیں لینا چاہتیں۔ پھر بغیر کچھ کئے ان کی گرہستی بھی کیسے چلے گی!"

بندو نے گلوگیر آواز سے کہا "یہ تو میں نہیں جانتی۔ لیکن تم میرے دیونا ہو اور وہ تم سے بھی بڑے ہیں، اچھی اچھی جو بات خیال میں کبھی نہیں لائی جا سکتی وہ بات بندو سے اسکے بعد کچھ نہ کہا گیا۔

مادھو نے کہا "اچھی بات ہے کم سے کم بھابھی کے پاس تو جاؤ۔ تاکہ ان کا غصہ اترے۔ وہ خوش ہوں۔ میرے پیر پکڑے

دن بھر بیٹھے رہنے سے بھی کچھ نہ ہو گا"۔

بندو اسی وقت پاؤں چھوڑ کر اٹھ بیٹھی۔ بولی "میری پاؤں پڑنے کی عادت نہیں ہے۔ اب سمجھی، کیوں اس روز رات کو انہوں نے پانی تک نہیں چھوا۔ اور سمجھ بوجھ کر دشمن کی طرح چپ رہے؟ میرا قصور بڑھ گیا۔ تم نے بات تک نہیں کی؟"

مادھو نے اپنے کاغذوں میں دھیان لگاتے ہوئے کہا "نہیں یہ گُر میں نے اپنے بھیا سے سیکھا ہے۔ بھگوان کریں ایسے ہی چپ رہ کر ایک روز یہاں سے کوچ کر دوں"۔

بندو نے اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔ وہ اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر کواڑ بند کر کے پڑ رہی۔

مادھو اٹھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں بندو پھر وہاں آ گئی۔ اس کی دونوں آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ مادھو کو رحم آ گیا بولے۔ ذرا جاؤ ان کے پاس۔ جانتی تو ہو نہیں۔ ذرا جا کر کھڑی ہو جاؤ ان کے سامنے، بس سب ٹھیک ہو جائے گا"۔

بندو نے نہایت غمگین لہجے میں کہا "تم جاؤ جی۔ میں للا کی قسم کھاتی ہوں"۔

مادھو نے اس کے دل کی بات تاڑ کر کچھ گرم ہو کر جواب دیا "ہزار قسم کھانے پر بھی میں بھیا سے جا کر نہیں کہہ سکتا۔ میری گردن اڑا دی جائے جب بھی مجھ سے یہ نہ ہو گا۔ بھلا وہ جب تک کچھ نہ پوچھیں میں خود جا کر ان سے کچھ کہہ سکتا ہوں!"

بندو پھر بھی وہاں سے نہ ہٹی۔

مادھو نے کہا۔ تم نہیں جا سکتیں ؟"

بندو نے جواب دیا۔" نہیں اور آہستہ آہستہ وہاں سے چلی گئی۔

x x x x

(۸)

مکان کے سامنے سے اسکول جانے کا راستہ تھا۔ پہلے پہل کئی دنوں تک للا چھتری کی اوٹ کر کے اسی راستے سے گیا تھا لیکن ادھر کچھ دنوں سے وہ لال چھتری اب اس راستے کے کنارے سے نہیں نکلتی تھی۔ راہ دیکھتے دیکھتے بندو کی آنکھیں تھک گئیں لیکن وہ کوٹھے کی چھت پر اوٹ میں بیٹھی ہوئی اس طرح ٹکٹکی باندھے سڑک کیطرف دیکھ رہی تھی۔ سویرے نو دس بجے کے اندر کتنے ہی قسم کی چھتریاں سر پر تانے کتنے ہی لڑکے اس راستے سے گذر گئے اور اسکول کی چھٹی کے بعد بھی کتنے لڑکے اس راستے سے لوٹے۔ لیکن وہ لال وہ چھتری بندو کو نہ دکھائی دی۔ وہ شام کیوقت آنکھیں پونچھتی ہوئی نیچے اتر آئی اور نریندر کو ایک طرف بلا کر پوچھنے لگی" کیوں رے نرین! ابھی تو اسکول جانے کا سیدھا راستہ ہے۔ پھر اب وہ ادھر سے کیوں نہیں جاتا؟

نریندر خاموش رہ گیا۔

بندو نے کہا" اچھا تو ہے۔ تم دونوں بھائی گپ شپ کرتے ہوئے ایک ساتھ آیا جایا کرو۔ یہ بہت اچھا ہے"

نریندر اپنے خاص انداز سے امول کو پیار کرتا تھا۔ وہ چپکے سے بولا" وہ شرم کے مارے ادھر سے نہیں جاتا۔ مامی! اب وہ دیکھو وہاں سے گھوم کر نکل جاتا ہے۔

بندو نے بمشکل تمام ہنس کر کہا۔ اس میں شرم کی بات کی ہے رے۔ نہیں نہیں تو کہہ دینا اس سے، اسی طرف سے آیا جایا کرے۔
نریندر نے سر ہلا کر کہا "وہ کبھی نہ جائے گا۔ ماں۔ جانتی ہو کیوں نہ جائے گا ماں!"
بندو نے بیقرار ہو کر پوچھا کیوں؟"
نریندر نے کہا "تم غصہ تو نہ ہو گی!"
"نہیں"
اس کے گھر پر کسی سے کچھ کہلاؤ گی تو نہیں"
"نہیں"
میری اماں سے بھی نہ کہو گی؟"
بندو نے مضطرب ہو کر کہا "نہیں رے نہیں تو بتا۔ میں کسی سے کچھ نہ کہوں گی"
نریندر نے آہستہ آہستہ کان میں کہا۔ تھرڈ ماسٹر نے اس کے اچھی طرح کان مروڑ دئیے تھے"
ایک ہی لمحہ میں بندو آگ کی طرح بھڑک اٹھی۔ بولی۔ کان کیوں مروڑے! میں نے تو بدن پر ہاتھ لگانے کی ممانعت کر دی تھی نا!"
نریندر نے ہاتھ ہلا کر کہا "اس کا کیا قصور ہے ماں! وہ نیا آدمی ٹھیرا۔ ہم لوگوں کا نوکر یہ ہیوا سالا ہی بدمعاش ہے۔ اسی نے آکر ماں سے کہہ دیا اور میری ماں بھی کم نہیں ہے اس لئے ماسٹر سے کہہ دینے کیلئے کہہ دیا بس تھرڈ ماسٹر نے فوراً اچھی طرح کان مروڑ دئیے۔
جانتی ہو ماں کیسے! دیکھو اس طرح پکڑ کر۔"

بندو نے فوراً اسے روک کر کہا۔ ہیوا نے کیا کہہ دیا!
نریندر نے کہا "کیا معلوم مامی۔ ہیوا ٹفن کے وقت میرا ناشتہ لے جاتا ہے۔ تو وہ دوڑ کر آکر پوچھا کرتا ہے "کون سا ناشتہ ہے۔ دیکھوں نرین بھیا! ماں نے سن کر کہا۔ اموں نظر لگا دیتا ہے"
للا کے لئے کوئی ناشتہ نہیں لے جاتا؟"
نریندر نے سر ٹھونک کر کہا وہ کہاں پائے گا مامی، وہ لوگ غریب آدمی ہیں جیب میں تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے لے جاتا ہے ٹفن کے وقت درخت کے نیچے بیٹھ کر چھپا کر انہیں کو کھا لیتا ہے"
بندو کی آنکھوں کے سامنے گھر دوار اور ساری دنیا گھومنے لگی وہ وہیں کی وہیں بیٹھی رہی"
بولی "نرین اچھا تو جا"
اس روز رات کو بہت دیر تک بلانے اور پکارنے کے بعد بندو کھانے بیٹھی تو اس سے کسی طرح کھانا نہ کھایا گیا۔ بالآخر طبیعت خراب ہے، کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دوسرے روز بھی تقریباً بغیر کھائے ہی پڑی رہی کسی سے کچھ بولی بھی نہیں۔ تلاش کے باوجود کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اسے بار بار یہی خطرہ محسوس ہونے لگا کہ کہیں بات کہنے میں اس کا اپنا قصور اور بھی سنگین نہ ہو جائے تیسرے پہر شوہر کے بھوجن کے وقت عادت کے مطابق وہ ان کے پاس بیٹھی۔ لیکن دوسری طرف دیکھتی رہی کھانے پینے کی چیزوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ بھی نہ سکی۔
گھر میں بتی جل رہی تھی۔ مادھو خمار آلود آنکھوں سے چپ چاپ پڑے ہوئے پڑھ رہے تھے، بندو بیروں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ مادھو

نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ کہا یہ کیا ہے؟"
بندو سر جھکائے شوہر کے پاؤں کی انگلی کا ناخن کھرچنے لگی۔
مادھو نے بیوی کے دل کی بات کا اندازہ کر کے اندر سے نرم ہو کر کہا میں سب کچھ سمجھتا ہوں بندو۔ مگر میرے بھیا کے پاس رونے سے کیا ہوگا! ان کے پاس جاؤ!" بندو سچ مچ رو رہی تھی۔ بولی تم جاؤ۔
میں جا کر تمہاری بات کہوں گا۔ بھیا نہ سنیں گے۔"
"میں جو کہتی ہوں مجھ سے قصور ہو گیا میں کان پکڑتی ہوں تم ان سے جا کر کہو"
"مجھ سے نہ ہو گا" کہہ کر مادھو کروٹ بدل کر سو رہے۔
بندو اسکے بعد بھی کتنی ہی دیر تک آس لگائے بیٹھی رہی مگر مادھو نے جب اسکے بعد بھی کچھ نہیں کہا تو وہ آہستہ سے اٹھ کر چلی گئی شوہر کے طرز عمل سے چشم زدن میں اسکے سینے میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پتھر کی طرح سخت احساس ہیں اہانت کوسوں تک پھیلے ہوئے سلسلۂ کوہ کی طرح کھڑا ہو گیا آج اسے یقینی طور پر معلوم ہو گیا ہے کہ بھی نے اسے چھوڑ دیا ہے
دوسرے روز صبح ہی یادو نے چھوٹی بہو کے جانے کی اجازت دیتے ہوئے ایک خط لکھ کر بھیج دیا۔ بندو کے باپ بیمار ہیں وہ فوراً روانہ ہو جائے بندو اشک آلود آنکھوں سے گاڑی پر سوار ہوئی۔ مصرانی نے گاڑی کے پاس جا کر کہا۔" پتاجی کو دیکھ کر جلد ہی آجانا بہو جی۔"
بندو نے گاڑی سے اتر کر اس کے پاؤں چھوئے تو مصرانی کچھ سی گئی۔ بندو کا اس قدر عجز و انکسار کسی نے کبھی نہ دیکھا تھا اس نے پاؤں چھو کر سر سے ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔" نہیں مصرانی جی کچھ بھی ہو تم برہمن کی لڑکی ہو۔ عمر میں بڑی ہو۔ دعا دو کہ اب میں لوٹ نہ سکوں

یہ جانا میرا آخری جانا ہو۔"

برہمن کی لڑکی اس کے جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ بندو کے دبلے اور افسردہ چہرے کی طرف دیکھ کر رو پڑی۔

ایلوکیشی موجود تھی وہ کھنکھتی ہوئی بولی "یہ کیا بات، چھوٹی بہو کیا اور کسی کے ماں باپ بیمار نہیں پڑتے۔"

بندو نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس نے منہ پھیر کر آنکھیں پونچھ لیں کچھ دیر بعد کہا "تمہیں نمسکار کرتی ہوں بی بی جی، میں چل دی۔"

بی بی جی نے کہا "جاؤ بہن جاؤ میں گھر میں موجود ہوں سب کچھ دیکھ بھال لوں گی"

بندو نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ کوچوان نے گاڑی ہانک دی۔

انپورنا مصرانی کے منہ سے یہ سب باتیں سن کر چپ ہو رہی۔ اس سے پہلے کبھی بندو للا کو چھوڑ کر میکے نہیں گئی تھی۔ آج مہینے بھر سے زیادہ ہو لیا وہ اسے ایک بار بھی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکی انپورنا اس کے دکھ کو سمجھ گئی۔

رات کو للا باپ کے پاس پڑا آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔ نیچے چراغ کی روشنی میں لتھری (بچھونا) سیتے سیتے انپورنا ایک گہری سانس لے کر بولی "رام! رام! جاتے وقت یہ کیا کہہ گئی! ابھی جانا آخری جانا ہو۔ درگا ماں کریں کہ میری بہو اچھی طرح لوٹ آئے"

بات سن کر یادو اٹھ کر بیٹھ گئے بولے "تم نے شروع سے آخر تک اچھا کام نہیں لیا بڑی بہو۔ میری بہورانی! تم میں سے کسی نے بھی نہیں پہچانا۔"

انپورنا نے کہا "وہ بھی تو ایک بار بھی کہہ کر پاس نہیں آئی۔ اپنے لڑکے اور تمہارے زبردستی لیے بیٹھی تھی۔ مگر وہ بھی نہیں کیا اس روز دن

بھر اتنی محنت کر کے گھر آرہی تھی۔ الٹے اور نہ جانے کتنی سخت باتیں سنا دیں۔"

یادو نے کہا۔" اپنی بہورانی کو تو صرف میں ہی سمجھتا ہوں۔ مگر بڑی بہو، اگر تم اتنا بھی معاف نہیں کر سکتیں تو بڑی کیوں ہوئی تھیں؟ تم جیسی ہو مادھو بھی ویسا ہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے تم لوگوں نے باندھ بوندھ کر میری بہورانی کے جان لے لیئے۔"

انپورنا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

للّا نے کہا۔" بابو جی! چھوٹی ماں نے کب آنے کو کہا ہے؟

انپوُرنا نے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ جائے گا تو اپنی چھوٹی ماں کے پاس!"

للّا نے گردن ہلا کر کہا۔" نہیں۔"

"نہیں کیوں رے! چھوٹی ماں تیرے نانا کے یہاں گئی ہے، تو بھی کل جا۔"

للّا چپ رہا۔"

یادو نے کہا۔ جائے گا رے للّا!"

للّا نے تکیئے میں منہ چھپا کر پہلے کی طرح سر ہلاتے ہوئے کہا" نہیں!"

کچھ رات رہتے ہی یاُدو اپنے کام پر جانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ پانچ چھ دن بعد کی بات ہے۔ ایک روز اسی طرح وہ بھور میں تیار ہو کر تمبا کو پی رہے تھے۔

انپورنا نے کہا۔" دیر ہوتی جا رہی ہے۔"

یادو نے پریشان ہو کر حقّہ رکھتے ہوئے کہا" آج طبیعت بیٹھی

خراب سی ہے۔ بڑی بہو! رات کو مجھے ایسا معلوم ہوا۔ جیسے میری بہو رانی اس دروازے کی اوٹ میں آکر کھڑی ہیں۔"

اس کے بعد درگا۔ درگا" کہہ کر وہ چل دئے۔

صبح انپورنا تھکی ہوئی سی رسوئی کا کام کر رہی تھی کہ اس گھر کے نوکر نے آکر خبر دی "بابو کل رات کو پھر اس ڈانگا" چلے گئے ہیں۔ چھوٹی بہو کی طبیعت شائد بہت خراب ہے"۔

اپنے شوہر کی بات یاد کرکے انپورنا کا سینہ کانپ اٹھا" کیا بیماری ہے رے"

نوکر نے کہا" یہ تو نہیں معلوم۔ سنا ہے بار بار غشی طاری ہو جاتی ہے۔ اور بہت بڑی بیماری ہو گئی ہے۔

شام کے بعد گھر آنے پر یادَو نے جو خبر سنی تو وہ رو دئے" کتنے شوق و آرزو سے سونے کی مورت گھر لایا تھا۔ بڑی بہو۔ مگر تم نے اسے پانی میں ڈبو دیا۔ میں ابھی فوراً جاؤں گا"

رنج اور افسوس سے انپورنا کا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ شائد وہ اصول سے زیادہ چھوٹی بہو کو پیار کرتی تھیں۔ اپنی آنکھیں پونچھ کر اور شوہر کے پیر دھو کر انہیں سندھیا کی پوجا کرنے کے لئے زبردستی بٹھا کر وہ اندھیرے برآمدے میں آکر بیٹھ رہیں کچھ دیر بعد ہی باہر مادھو کی آواز سنائی دی انپورنا زور سے اپنا سینہ تھام کر دونوں کانوں میں انگلی دئے جی کڑا کرکے بیٹھی رہیں۔"

مادھو رسوئی گھر میں اندھیرا دیکھ کر ادھر والے کمرے میں آئے اور اندھیرے میں انپورنا کو دیکھ کر خشک گلے سے بولے" بھابھی! سُن لیا ہوگا۔ شائد؟" انپورنا سر نہ اٹھا سکی۔

مادھو نے کہا " ایک بار امول کا جانا بہت ضروری ہے۔ شاید آخری وقت آپہنچا ہے "

انہوں نا منہ کے بل پڑ کر زور سے رو پڑی یادو اس کمرے سے پاگل کی طرح دوڑے ہوئے آئے اور بولے ایسا نہیں مادھو۔ میں کہتا ہوں نہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اپنے علم اور لاعلمی میں کسی کو دکھ نہیں دیا۔ مجھے بھگوان اس عمر میں کبھی ایسی سزا نہ دیں گے "

مادھو خاموش رہے۔

یادو نے کہا " مجھے سب باتیں کھول کر بتا۔ میں جا کر بہورانی کو واپس لوالاؤں گا۔ تو پریشان نہ ہو مادھو۔ گاڑی ہے ساتھ میں؟ "

مادھو نے کہا میں پریشان نہیں ہوں بھیا۔ لیکن آپ خود کیا کر رہے ہیں؟

" کچھ نہیں۔ اٹھو بڑی بہو۔ آرے امول "

مادھو نے روکتے ہوئے کہا۔ رات گذر جانے دو نہ بھیا "

" نہیں نہیں ایسا نہ ہوگا۔ تو نہ گھبرا مادھو۔ گاڑی والے کو جلا لا نہیں تو میں پیدل ہی چل دوں گا "

مادھو نے اب کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ گاڑی لینے چل دیا گاڑی آتے ہی چاروں اس پر بیٹھ گئے "

یادو نے کہا۔ اس کے بعد؟ "

مادھو نے کہا " میں تو تھا نہیں۔ ٹھیک نہیں جانتا سنا ہے کہ چار۔ پانچ روز پہلے خوب زور کا بخار آیا تھا اور بار بار بیہوشی طاری ہو جاتی تھی تب سے اب تک اسے کوئی دوا یا ایک قطرہ دودھ تک نہیں پلایا جا سکا ہے کچھ کہہ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوا ہے لیکن اب امید تو نہیں ہے "

یادو نے پرزور لہجے میں کہا۔"امید کیوں نہیں۔ ہزار بار امید ہے میری بھورانی زندہ ہے مادھو بھگوان! میری زبان سے اس آخری عمر میں جھوٹ بات نہ کہلائیں گے۔ میں نے آج تک جھوٹ نہیں بولا۔"

مادھو اسی وقت جھک کر بھائی کے پاؤں چھو کر اور پیشانی کو ہاتھ لگا کر چپ چاپ بیٹھا رہا۔"

(۹)

کتنے دنوں سے بندو بغیر کھائے پیئے اپنی صحت کو نقصان پہنچاتی چلی آ رہی تھی کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ میکے پہنچتے ہی اسے بخار آ گیا دوسرے روز دو تین بار بیہوشی آئی اور اس کی آخری بیہوشی ختم نہ ہونا چاہتی تھی بہت کوششوں کے بعد بہت دیر پر جب اسے کچھ ہوش آیا تو اس کی نبض بالکل ساکت ہو گئی تھی۔ خبر پا کر مادھو آئے اس نے اپنے شوہر کے پاؤں چھو کر اسے پیشانی سے لگایا لیکن اپنے دانت بھینچ لئے سینکڑوں منت و آرزو کرنے پر بھی اس نے ایک قطرہ دودھ نہ پیا۔

مادھو نے مایوس ہو کر کہا۔" خودکشی کیوں کر رہی ہے؟"

بندو کی آنکھوں سے آنسو ڈھلکنے لگے کچھ دیر بعد اس نے آہستہ آہستہ کہا۔"میرا سب کچھ للا کا ہے۔ صرف دو ہزار روپے خرید کر دینا اور اسے پڑھانا۔ وہ میرے للا کو پیار کرتا ہے۔"

مادھو نے بمشکل تمام دانتوں سے ہونٹ دبا کر اپنی آتی ہوئی رلائی کو روکا بندو نے اشارے سے انہیں اور بھی پاس بلا کر چپکے سے کہا۔ اس کے سر! مجھے اور کوئی آگ نہ دے۔"

مادھو نے اس ضرب کو بھی برداشت کر کے اس کے کانوں

میں کہا کسی کو دیکھنا چاہتی ہو؟"

بندو نے سر ہلا کر کہا "نہیں رہنے دو"

بندو کی ماں نے ایک بار دوا پلانے کی کوشش کی لیکن بندو نے اسی طرح مضبوطی سے دانت بھینچ لئے۔

مادھو اٹھ کر کھڑے ہو گئے، بولے "یہ نہیں ہو گا۔ بندو۔ ہم لوگوں کی بات تم نے نہیں مانی۔ جن کی بات ٹال نہیں سکتیں ہیں انہیں کو لینے جاتا ہوں صرف میری اتنی بات مان لینا کہ میں تمہیں لوٹ کر دیکھ سکوں

مادھو نے باہر آ کر آنکھیں خشک کر لیں۔ اس رات کو بندو پُر سکون ہو کر سو گئی۔ اس وقت سورج طلوع ہو رہا تھا، مادھو کمرے میں گھسے اور انہوں نے جیسے ہی چراغ بجھا کر کھڑکیاں کھولیں اور بندو نے آنکھیں اٹھا کر صبح کی شفاف روشنی میں شوہر کا منہ دیکھا تو ذرا مسکرا کر کہا "کب آئے؟"

"ابھی چلا آ رہا ہوں۔ بھیا پاگلوں کی طرح رو دھو رہے ہیں"

بندو نے آہستہ سے کہا "یہ تو میں جانتی ہوں۔ لیکن ان کے چرنوں کی دُھول لائے ہو؟"

مادھو نے کہا "وہ باہر بیٹھے ہوئے تمبا کو پی رہے ہیں بھابھی ہاتھ پاؤں دھو رہی ہیں للا گاڑی ہی میں سو گیا ہے اوپر سلا دیا ہے۔ لے آؤں؟"

بندو نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا "نہیں رہنے دو۔ اور آہستہ سے کروٹ بدل کر دوسری طرف منہ کر کے پڑ رہی۔

انپورنا جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے سرہانے بیٹھ کر سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ چونک پڑی۔ انپورنا نے ایک منٹ اپنے کو

روک کر پھر کہا۔" دوا کیوں نہیں پیتی چھوٹی بہو کیا مرنا چاہتی ہے۔ اسی لئے؟"
بندو نے جواب نہیں دیا۔
اینورنا نے اس کے کان کے پاس منہ لے جاکر چپکے سے کہا۔" میرا سینہ پھٹا جارہا ہے۔ اسے تو سمجھ رہی ہے؟"
بندو نے اسی طرح آہستہ سے جواب دیا۔" سب سمجھ رہی ہوں جیجی۔"
" تو پھر منہ پھیر ادھر۔ تیرے جیٹھ جی تجھے گھر لے جانے کے لئے آئے ہیں۔ تیرا للا رو رو کر سو گیا ہے۔ بات سُن۔ منہ پھیر ادھر۔"
پھر بھی بندو نے منہ نہیں پھیرا۔ سر ہلا کر کہا۔ نہیں جیجی پہلے..."
اس وقت یادو کے دروازے کے پاس آکر کھڑے ہوتے ہی اینورنا نے بندو کی پیشانی پر چادر کھینچ دی۔ یادو نے لمحہ بھر تک سر تاپا کپڑوں سے ڈھکی ہوئی اپنی عزیز ترین محبوب ہستی چھوٹی بہو کی طرف دیکھا اور اپنے آنسو روکتے ہوئے کہا۔" گھر چلو بہو رانی، میں لوانے آیا ہوں۔
ان کے سوکھے اور کمزور چہرے کی طرف دیکھ کر سب کی آنکھیں بھر آئیں یادو پھر ایک لمحہ خاموش رہ کر بولے۔" اور ایک دن جب تم اتنی سی تھیں بیٹی۔ تو میں ہی آکر اپنے گھر کی لچھمی رانی کو لوا لے گیا تھا یہاں پھر آنا ہوگا۔ یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔ تو بیٹی سنو جب آیا ہوں تو یا تو ساتھ ساتھ لوا لے جاؤں گا۔ یا پھر اس گھر کی طرف کبھی رُخ ہی نہ کروں گا۔ جانتی تو ہو رانی بیٹی۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔"
یادو باہر چلے گئے۔ بندو نے منہ پھیر کر کہا۔" لاؤ جیجی۔ کیا کھانے کو دیتی ہو اور للا کو میرے پاس لٹا کر تم سب باہر جاؤ اور آرام کرو اب ڈر نہیں ہے۔ میں نہیں مروں گی۔"

باب

(۱)

شادی

آج ساگر پور میں بڑی دھوم دھام ہے۔ نوبت اور نقاروں کے ہنگامے گاؤں کا گاؤں ہنگامہ زار بنا ہوا ہے ایک ہفتے سے یہاں کیسا شور و غل برپا ہے۔ اسے گاؤں اور اس کے ارد گرد چار پانچ کوس کے سبھی لوگ جانتے ہیں۔ اس شاہی تقریب میں ڈھول اور نقاروں کا ایسا عظیم الشان اجتماع، نوبت والوں کا ایسا بہترین انداز اشتراک۔ پیتل کے باجوں کا ایسا زبردست طوفان دیکھنے میں آیا جو اس سے پہلے گاؤں والوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ طرح طرح کے باجہ کے ذریعہ انسانوں میں جو مسّرت خیز ہلچل برپا ہو گئی تھی۔ اس نے گاؤں کے مویشی بہت ہی ناخوش ہو گئے تھے۔ خصوصاً گائے اور بچھڑے ڈھول اور نقاروں کے شور و ہنگامے کے باعث ان کی پریشانی کی حد نہ تھی اس عظیم الشان جشن کی وجہ تھی۔ چودہ سال کے ایک نابالغ لڑکے کی شادی!

ساگر پور کے زمیندار شریمان ہر دیو متر کے اکلوتے بیٹے کی تقریب، شادی میں یہ دھوم مچی ہوئی ہے۔ ہر دیو متر کافی بڑے آدمی ہیں

تقریباً ۲۵-۲۶- ہزار سالانہ ان کی آمدنی ہے۔ بیٹے کا نام ہے، ستیندر کمار متّر۔ جو ہیر صاحب کے اسکول میں انٹرنس کلاس میں پڑھتا ہے۔ اس کم عمری میں شادی ہونے کی وجہ ستیندر کی ماں کا یہ شوق ہے کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کی دولہن کا منہ جلد سے جلد دیکھیں۔

بردوان ضلع کے دِل جان پور کے زمیندار شریمان کاما کھیا چرن چودھری کی سب سے چھوٹی لڑکی سرلا کے ساتھ ستیندر کی شادی ہو گئی۔ گوری اور خوبصورت دولہن ہے۔ ستیندر بہت ہی خوش ہے دس سال کی حسین اور گوری چھوٹی دولہن کا منہ دیکھ کر ستیندر کی ماں بھی بہت خوش ہوئی۔ شادی کے دوسرے ہی سال ہردیو بابو دلہن کو رخصت کرا لائے۔ کیونکہ مالکن کو یہ پسند نہ تھا کہ وہ بہو کو میکے ہی میں چھوڑ دیں۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ شادی کے بعد لڑکی کو میکے میں نہیں رکھنا چاہیئے اور ان کا خیال کچھ بُرا بھی نہ تھا!

ستیندر کی تعلیم کی سہولت کے لئے ہردیو بابو کو مع بیوی کے کلکتہ ہی میں رہنا پڑتا تھا۔ سرلا بھی کلکتہ آ گئی تھی۔ کم عمری میں شادی ہوئی تھی۔ اس لئے سرلا ہردیو بابو سے بولتی چالتی تھی۔ یہاں تک کہ ستیندر کی موجودگی میں بھی وہ ان سے باتیں کرتی تھی۔ ساس کو اس سے خوشی ہی ہوتی۔ ناخوشی نہ ہوتی۔

کچھ روز بعد کاما کھیا بابو سرلا کو اپنے یہاں لیوا گئے اس کے دو ایک مہینے بعد ایک بار ستیندر نے غصّہ ہو کر کہا۔ کتابوں پر گرد جم گئی ہے۔ دوات میں سیاہی خشک ہو گئی ہے کوئی ایسا نہیں کہ انہیں دیکھے بھالے"۔

داں بیٹے کا مطلب سمجھ گئیں اور اس کی بات ہردیو بابو کے کانوں تک پہنچ گئی۔ انہوں نے ہنس کر بہو کو رخصت کرانے کے لئے آدمی بھیج دیا۔ لکھ دیا، یہاں گھر میں بہت فساد برپا ہو گیا ہے جو بہو کے آئے بغیر شاید دور نہ ہو سکے۔ اس لئے بہو کو ضرور رخصت کر دیجئیگا

سرلا پھر آئی۔ ستیندر کے چھوٹے موٹے کام وہی کیا کرتی تھی۔ کتابوں کو جھاڑ پونچھ کر ٹھیک طور پر سجا کر رکھنا۔ کالج جانے کے بعد کپڑے ٹھیک سے تیار رکھنا۔ یعنی جلدی میں دو کفوں میں دو طرح کے بٹن نہ لگ جائیں۔ یا کھانے میں بہت دیر ہو گئی ہو۔ کالج کا گھنٹہ گذرتا جا رہا ہو۔ ایسے موقع پر کہیں ایک پاؤں میں کارپیٹ کا جوتا۔ اور دوسرے میں بارنش کا جوتا نہ پہن لیا جائے۔ اجلے صاف کوٹ پر کہیں دھوبی کے گھر قدم رنجہ فرمانے کے لئے تیار کیا ہوا دوپٹہ ظلم نہ کر بیٹھے۔ ان سب کاموں کو سنبھالا کرتی تھی۔ سرلا کے نہ رہنے سے اکثر ایسی ہی بدعنوانی ہوا کرتی تھی۔ ایسا بے پروا آدمی کبھی کسی نے نہ دیکھا ہو گا۔ یہ سب کام سرلا کے سوا اور کسی سے ہوتے بھی نہ تھے۔ اور ہوتے بھی تھے۔ تو وہ ستیندر کی آنکھوں کو نہ لبھاتے۔ اس لئے سرلا ہی کو سب کچھ کرنا پڑتا تھا۔

---

(۲)

سوشیلا کے بچے کا انپراشن

سوشیلا سرلا کی بڑی بھین ہے۔ اس کے لڑکے کا انپراشن[1] تھا۔ لہٰذا کاماکھیا بابو اپنے ناتی کے انپراشن کی تقریب پر سرلا کو رخصت کرانے کے لئے کلکتہ آئے۔

سرلا کی بھین نے سرلا اور ستیندر کو آنے کے لئے خاص استدعا کے ساتھ خط لکھا تھا۔ کیونکہ سرلا تقریباً تین سال سے دل جان پور نہیں گئی تھی۔ ستیندر بھی جب چلنے کے لئے راضی ہو گیا تو کاماکھیا بابو نہایت مسّرت کے ساتھ داماد اور لڑکی کو لے کر گاؤں چلے آئے۔ سرلا کی ماں بہت دنوں بعد لڑکی اور داماد کو پاکر بہت خوش ہوئی۔ جس کے لڑکے کا انپراشن ہے۔ اس نے بھی آکر ان دونوں کو بہت سی باتیں سنائیں اور مختلف طریقوں سے انہیں خوش کیا۔

تقریب کے بخیر و خوبی ختم ہو جانے کے بعد ستیندر نے گھر جانا چاہا مگر ساس نے اس کی خاص طور سے مخالفت کی۔ کہا۔ "اتنے دنوں بعد آئے ہو۔ کچھ روز اور رہ لو تو جانا۔"

سرلا نے بھی روکا اس لئے ستیندر دو چار روز اور رہنے کیلئے رضامند ہو گیا۔ دو چار روز اور گذر گئے۔ پھر بھی سرلا سے جانے دینا

---

[1] شیر خوار بچے کو اناج کھلانا شروع کرنے کی رسم

نہ چاہتی تھی۔ لیکن بغیر گئے بھی کام نہ چل سکتا تھا پڑھائی کا بہت حرج ہوگا امتحان کو بھی زیادہ دن نہیں ہیں۔ چلتے وقت سرلا نے پوچھا "مجھے پھر کب سلوا جاؤ گے؟"

ستیندر نے کہا۔ جب تم جانا چاہو گی۔"

"تو مجھے دس بارہ روز بعد ہی آکر سوا جانا۔"

ستیندر بہت خوش ہوا۔ اسے ایسی امید نہ تھی۔

اس کے بعد سرلا نے شوہر کو آنسوؤں کے درمیان رخصت کرتے ہوئے کہا "دیکھنا میرے لئے زیادہ فکر کرنا۔ اور رات رات بھر پڑھ کر بیمار بھی نہ ہو جانا۔"

رات کو دس بجے سے زیادہ نہ پڑھنے کے لئے سرلا نے اپنے سر کی قسم دلا دی۔ نہ جانے کیسا خالی خالی سا اداس دل لے کر ستیندر کلکتے پہنچا ستیندر ایک کتاب لئے بیٹھا تھا۔ کتاب کے اوراق کے ساتھ دل کی زبردست کشمکش شروع ہو گئی۔

ستیندر نے گن کر دیکھا۔ اس نے دن بھر میں صرف ۴۶ سطریں پڑھی تھیں۔ اس نے غمگین ہو کر سوچا واہ اس طرح پڑھنے سے تو پاس ہو چکا۔ رفتہ رفتہ معمولی غم غصے سے تبدیل ہو گیا۔ اس نے سوچا یہ سب اسی شریر سرلا کا قصور ہے آج پانچ روز آئے ہوئے ہو گئے۔ ذرا بھی نہ پڑھ سکا۔ پہلے سوچتا تھا کہ پڑھتے وقت وہ تنگ کیا کرتی ہے۔ دس بجے کے بعد پڑھ نہ سکوں۔ اس لئے روشنی گل کر دیتی ہے اسے کہیں بھیج بھاج کر اچھی طرح پڑھوں گا۔ مگر ہوا بالکل اس کے برعکس۔ کل ہی اسے سوا نے جاؤں گا نہیں تو کیا شرم کیلئے فیل ہو جاؤں؟

کچھ بھی ہو ستیندر رنا تھا اس طرح کی کوئی ترکیب نکال رہا تھا کہ کیسے اسے بلایا جائے؟ کہوں تو کیسے کہوں؟ شرم لگتی ہے۔ اس سے اتنی محبت کیسے ہو گئی؟ دو دن . . . ."

اتنے میں نوکر نے آکر ایک ٹیلیگرام دیا۔ ستیندر نہایت حیران ہوا اب سوچنے کا وقت نہیں کہاں کا تار ہے؟ لفافہ کھولتے ہی ستیندر کا دل کانپ اٹھا۔ اندر جو کچھ لکھا تھا۔ اس سے اس کا سر یکبارگی چکرا گیا۔ سرلا بیمار ہے۔

ہردیو بابو اسی روز ستیندر کو ساتھ لے کر دل جان پور کے لئے روانہ ہو گئے۔

مکان کے سامنے ہی کا ماکھیا بابو سے ان کی ملاقات ہو گئی ہردیو بابو نے چلا کر پوچھا "بہو کی طبیعت کیسی ہے؟"

ہردیو بابو نے اندر جا کر دیکھا۔ سرلا ہیضے میں مبتلا تھی ایک ہی روز میں گویا سرلا کا پہچاننا دشوار ہو گیا۔ آنکھیں بیٹھ گئی ہیں۔ کنول کی طرح کھلے ہوئے مکھڑے پر سیاہی چھا گئی ہے۔ تجربہ کار ہردیو بابو سمجھ گئے۔ حالت اچھی نہیں ہے آنکھیں خشک کرتے ہوئے پکارا "سرلا بیٹی!"

سرلا نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اس وقت تک سرلا کو کافی ہوش تھا۔ کیسی طبیعت ہے بیٹی؟"

سرلا نے ہنس کر کہا "اچھی تو ہوں"

دونوں سمجھ گئے۔ آپس میں سمجھوتہ ہو گیا۔ سب کے چلے جانے پر ستیندر پاس آکر بیٹھ گیا۔ خطرے کے احساس کے باعث اس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلی۔ پھر زبردستی بیٹھے ہوئے بے کیف گلے سے

ستیندر نے پکارا۔ "سرلا"!

بیٹھی ہوئی سوکھی آواز ہے تو کیا حرج ہے۔ ہے تو وہی ہمیشہ کی کاوش آشنا آواز۔ وہی پیار کی پکار۔ سرلا! اس میں کیا غلطی ہو سکتی ہے؟ سرلا نے آنکھیں کھولیں اور دیکھا۔ اس نے ہر دیو بابو کو دیکھ کر پہلے ہی سے ستیندر کے آنے کا کچھ انداز کر لیا تھا۔

سرلا شوہر سے مذاق کرنا بہت پسند کرتی ہے۔ اس نے ہنس کر کہا۔ کیا لینے آئے ہو؟"

آواز بیٹھ گئی ہے۔ اب تک ستیندر کسی طرح آنسوؤں کو روکے ہوئے تھا۔ سرلا کی حالت دیکھ کر اس کا وہ ریت کا بند ٹوٹ گیا۔

ستیندر جانتا تھا کہ اس وقت رونا نہیں چاہیئے۔ مگر جلی آنکھوں کو اتنی سمجھ کہاں؟ آہستہ آہستہ آنسوؤں نے یکے بعد دیگرے قطروں کی صورت میں ٹپکنا شروع کر دیا۔ آج وہ سرلا کے جسم میں سمائے جا رہے ہیں کیا اس کے پہلے انہیں کبھی ایسا موقع حاصل ہوا ہے؟ کبھی نہیں۔ تمہاری یا سرلا کی خاطر کیا وہ ایسے موقع کو چھوڑ دیں؟ سرلا نے کبھی شوہر کو روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی رو دی۔ بہت دیر بعد آنکھیں پونچھ کر بولی۔ "چھی روتے کیوں ہو؟ مرد بھی کہیں روتے ہیں؟ "یہ کیا؟ ٹھیک ہے سرلا، خوب سمجھیں! وہ اندرونی تپش سے سوکھ کر پتھر ہو جائیں۔ مگر ایک بوند بھی باہر نہ گرنے پائے! آنسو عورتوں کے لئے ہیں۔ مردوں کو اس میں ہاتھ لگانے کا اختیار نہیں قلبی اذیت سے جل جل جاؤ۔ مگر رو نے نہیں پاؤ گے رونے سے عورت جو ہو جاؤ گے۔ سرلا۔ کیا یہ ضابطہ تمہیں لوگوں نے بنایا ہے؟"

سرلا نے شوہر کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دبا کر روتے ہوئے کہا۔ "دوسرے جنم کا تمہیں یقین ہے ؟"

ستیندر نے بھی روتے ہوئے کہا۔ یقین تھا یا نہیں یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ مگر آج سے پورے طور پر یقین رکھوں گا۔"

سرلا کے چہرے پر تبسم کی جھلک نمودار ہوئی۔

دوا پلانے کا وقت قریب دیکھ کر کاما کھیا بابو ہردیو بابو اور ڈاکٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے نبض دیکھ کر کہا۔

امید بہت کم ہے اب ایشور کی مرضی۔"

ایشور کی مرضی سے دوسرے روز سویرے سات بجے سرلا کا انتقال ہو گیا۔

شام کے وقت ہردیو بابو ستیندر کو لے کر کلکتے لوٹ آئے۔

(۳)

پھر شادی

کیا جانے کیا ہو گیا ہے، شاہی بستر پر لیٹ کر کچھ کچھ آسمانی عیش و راحت محسوس کر رہا تھا۔ کسی نے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور تمام عیش و راحت کو خاک میں ملا دیا۔ آدھی رات کے وقت اٹھ کر بیٹھ گیا ہوں۔ نیند اچٹ گئی ہے۔ اپنی شریک زندگی کی اس نیم شکستہ کھاٹ پر پڑا ہوا ہوں۔ میں روؤں یا ہنسوں ؟ عیش و آرام کے سیلاب میں افق کی طرف بہا جا رہا تھا۔ جیسے یکا یک کچھ انجان آدمیوں کے

جال میں بندھ گیا ہوں۔ اب شاید کبھی بہہ کر نہ جاسکوں گا۔ سب کچھ جیسے الٹ گیا ہے۔ زندگی کے مرکز کو بھی جیسے کوئی کھینچ کر اس کے دائرے کے باہر لے گیا ہے۔ کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے! یہ کیا ہو گیا ہے؟ آدھی رات کا وقت تھا۔ ستیندر ناتھ کھڑکی کے پاس بیٹھا ہوا ساگر پور کی تاریکی دیکھ رہا تھا۔ پیڑ پودے نہ جانے کیسے ایک پر سکوت انداز سے ستیندر کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔

بادِ شبانہ سائیں سائیں کرتی بہتی ہوئی نکل گئی وہ کچھ کہہ گئی کیا؟ کہا کیوں نہیں؟ وہی ایک ہی بات۔ سبھی چیزیں وہی ایک بات کہتی پھرتی ہیں کہ کیا ہو گیا ہے! پپیہا اب پی پی نہیں کہتا۔ جیسے بالکل اس کا الٹا کہتا ہے۔ مر گئی! ہائے ہائے! فاختہ بھی اب بولی نہیں بولتی۔ بہو بات کرے کی بجائے اب وہ بھی "بہو گئی مر" کہتی ہے۔ سبھی چیزیں وہی ایک ہی بات بار بار کیوں کہتی پھرتی ہیں؟ اور سائیں سائیں" کرتی ہوئی جو بادِ شبانہ چل رہی ہے۔ وہ بھی جیسے ٹھیک یہی بات کہتی ہے "نہیں ہے۔ نہیں ہے۔ وہ نہیں ہے"

کیسی طبیعت ہے ستیندر؟ کیا سر میں بہت زیادہ درد معلوم ہو رہا ہے؟ اس بات کو تو آج بہت روز ہو گئے۔ ذرا سو جاؤ نہ بھئی۔ کیا ہمیشہ اسی طرح اس کھڑکی کے پاس بیٹھے رہو گے؟ ستیندر تاریکی میں تارے دیکھ رہا تھا۔ ان میں جو سب سے پھیکا تھا اسے اور بھی بڑے غور کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

آنکھیں میچنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ کہیں وہ کھو نہ جائے دیکھتے ہی دیکھتے تک۔ جانے پھر وہ وہیں سو جاتا سویرے

آنکھ کھلنے پر پھر اسی کو دیکھنے کی کوشش کرتا۔ اب اسے روشنی اچھی نہیں معلوم ہوتی۔ چاندنی سے اب اسے لطف حاصل نہیں ہوتا۔ اتنی دھندلی روشنی والا تارہ کہیں روشنی میں نظر آسکتا ہے۔

ستیندر ایم۔ اے میں فیل ہوگیا ہے۔ اب اسے پاس ہونے کی بھی تمنّا نہیں رہی۔ اب اس کا حوصلہ بھی بجھ سا گیا ہے کیا "پاس" کرنے سے تارہ نزدیک آجاتا ہے؟

ہردیو بابو اپنے اہل و عیال کے ساتھ گاؤں چلے آئے ستیندر کہتا ہے۔ وہ گھر ہی سے اچھی طرح امتحان دے سکتا ہے شہر کے اتنے شور و غل میں پڑھائی ٹھیک نہیں ہوتی۔ ستیندر اب کچھ اور ہی طرح کا آدمی ہو گیا ہے اس کا چہرہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اسے بہت دنوں سے کھانے کو نہ ملا ہو۔ جیسے کسی بڑی بھاری بیماری سے ابھی ابھی صحت پائی ہے۔

دوپہر کو ستیندر کمرے کے کواڑ دے کر فوٹو گراف جھاڑ پونچھ کر صاف کیا کرتا۔ اپنی پرانی کتابیں سجانے بیٹھ جاتا اور ہارمونیم کا ڈھکنا اٹھا کر یوں ہی صاف کیا کرتا۔ سرلا کی صاف ستھری کتابوں کو اور بھی صاف کرنے لگتا۔ اچھے اچھے کاغذ اور لفافے لے کر سرلا کو خط لکھتا اور نہ جانے کیا پتہ لکھ کر اپنے بکس میں بند کر کے رکھ دیتا ستیندر ناتھ۔ تم اکیلے نہیں ہو۔ بہتوں کی تقدیر تمہاری ہی طرح کم عمر میں جل کر خاک ہو جاتی ہیں۔ کیا سبھی تمہاری طرح پاگل ہو جاتے ہیں؟ ہوشیار ستیندر! تمام باتوں کی ایک حد ہوتی ہے۔ محبت کی بھی ایک حد مقرر ہے۔ اگر خدا سے تجاوز کرو گے تو تکلیف پاؤ گے کوئی کسی کو نہیں

رکھ سکتا۔

ستیندر کی ماں بڑی عقلمند ہیں۔ انہوں نے ایک روز شوہر کو بلاکر کہا "ستیندر ہمارا کیسا ہو گیا ہے۔ دیکھتے ہو؟"

"دیکھ تو رہا ہوں۔ مگر کیا کیا جائے؟"

"دوسری شادی کر دو۔ اچھی بہو آ جانے پر میرا ستنیہ پھر ہنسنے لگیگا پھر بولنے چالنے لگیگا۔"

"اس روز ستیندر کھانا کھانے بیٹھا تو ماں نے کہا "میری بات مانے گا بیٹا"

"کیا؟"

تجھے پھر شادی کرنی ہو گی"۔

ستیندر نے ہنس کر کہا "یہی بات ہے تو اس عمر میں اب اس کی کیا ضرورت؟"

ماں نے پہلے ہی سے آنسو اکٹھے کر رکھے تھے وہ اب بغیر بات ہی کے جاری ہو گئے۔ انہوں نے آنکھیں خشک کر کے کہا "بیٹا۔ اکیس برس کوئی عمر بھلا عمر ہے؟ لیکن سرلا کی بات یاد آنے پر یہ سب باتیں زبان پر لانا کوئی جی نہیں چاہتا مگر مجھ سے اب تنہا نہیں رہا جاتا"۔

دوسرے روز سویرے ہر دیو بابو نے بھی ستیندر کو بلاکر یہی بات کہی۔ ستیندر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ہر دیو بابو سمجھ گئے۔ خموشی نیم رضامندی ہی کی علامت ہے۔

ستیندر نے اپنے کمرے میں آکر سرلا کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر کہا "سنتی ہو سرلا۔ میری شادی ہو گی"۔

تصویر بول نہیں سکتی۔ بول سکتی تو کیا کہتی؟ کہتی۔ اچھی بات ہے۔ اور کیا کہتی۔"

(۱۴)

نلنی

اب کی بار ستیندر کی شادی کلکتہ میں ہوئی۔ رونمائی کے وقت ستیندر نے دیکھا۔ بہت خوبصورت بیوی ہے۔ ہونے دو خوبصورت پھر بھی اس لئے سوچا۔ سر پر ایک بار آپڑا۔

شادی کے بعد دو سال تک نلنی میکے ہی میں رہی۔ تیسرے سال وہ سسرال آئی۔ ساس نے نئی بہو کا چاندسا مکھڑا دیکھ کر سرلا کو بھولنے کی کوشش کی۔ ازسرنو گھر گرہستی چلانے کی کوشش کی۔ رات کو جب ستیندر اور نلنی دونوں پاس پاس سوتے۔ تو کوئی کسی سے نہ بولتا۔

نلنی سوچتی۔ کیوں؟ اتنی بے التفاتی اور ناقدری کیوں؟

ستیندر سوچتا۔ یہ کہاں کی کون ہے۔ جو میری سرلا کی جگہ سویا کرتی ہے؟

نئی بہو شرم کے مارے شوہر سے بات نہیں کر سکتی۔ ستیندر سوچتا بولتی نہیں۔ یہی اچھا ہے!

ایک روز رات کو ستیندر کی نیند کھل گئی۔ اس نے دیکھا۔ بچھونے پر کوئی نہیں ہے۔ اچھی طرح نگاہ اٹھا کر دیکھا تو کوئی کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ کھلی کھڑکی سے چاندنی داخل

داخل ہو رہی ہے اسی اجالے میں ستیندر کو نلنی کے چہرے کا کچھ حصہ دکھائی دے گیا۔

نیند کے خمار میں۔ چاندنی کی روشنی میں اسکا چہرہ بہت حسین معلوم ہوا۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ نلنی رو رہی ہے!

ستیندر نے بلایا "نلنی"

نلنی چونک پڑی۔ پتی دیو بیدار ہے ہیں۔ معلوم نہیں اور کوئی ہوتی تو کیا کرتی۔ لیکن نلنی آہستہ سے آ کر پاس بیٹھ گئی۔

ستیندر نے کہا۔ روتی کیوں ہو؟ روتی کیوں ہو؟" آنسوؤں کی دھار اور زور سے بہنے لگی اس کی سولہ برس کی عمر میں شوہر کی یہی پیار کی بات ہے۔ بہت دیر تک دبا دبا کر رونے کے بعد آنکھیں پونچھ کر اس نے آہستہ سے کہا۔ میں تمہیں دیکھنے میں کیوں اچھی نہیں لگتی؟"

معلوم نہیں کیوں؟ ستیندر کو بھی اندر سے بڑی رلائی آ رہی تھی۔ اس نے اسے روکتے ہوئے کہا "یہ تم سے کس نے کہا کہ تم مجھے اچھی نہیں لگتیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ میں تمہاری خبر گیری نہیں کر سکتا۔

نلنی جواب دئے بغیر تمام باتیں خاموشی کے ساتھ سننے لگی۔

ستیندر کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد پھر کہنے لگا "سوچا تھا یہ بات کسی سے نہیں کہوں گا مگر نہ کہنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہے [illegible] تم سے کچھ چھپاؤں گا۔ تمام باتیں کھول کر کہہ دینا۔ تو سمجھ جاتیں۔ کہ میں ایسا کیوں ہوں۔ میں اب بھی سرالو۔ اپنی پہلی بیوی کو بھول نہیں سکا ہوں۔ نہ اس بات کا بھروسہ ہی ہے کہ بھول جاؤں گا نہ جی ہی چاہتا ہے۔ تم ایک بدقسمت کے لئے آ پڑی ہو مجھے [illegible] کی امید بھی نظر نہیں

آتی۔ کہ میں تمہیں کبھی آرام دے سکوں گا۔ میں نے اپنی خواہش سے تم سے شادی نہیں کی۔ اور نہ اپنی خواہش سے تم سے محبت کر سکوں گا

گہری رات میں دونوں بہت دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے۔ ستیندر سمجھ گیا نلنی رو رہی ہے وہ بھی رویا تھا کیا؟ ایک ایک کر کے سرلا کی باتیں یاد آنے لگیں۔ رفتہ رفتہ اس کی صورت دل میں بیدار ہو گئی۔ ’لینے آئے ہو؟ یاد آ گیا۔ بے بلائے آنسوؤں نے آکر ستیندر کی نگاہ بند کر دی۔ اس کے بعد وہ گالوں پر سے ڈھلک کر نیچے گرنے لگے۔

آنکھیں پونچھ کر ستیندر نے آہستہ سے نلنی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا ”رو ؤمت نلنی! میرا اس میں کیا ہاتھ ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔ ان دنوں میں اندر ہی اندر کیسا درد و غم برداشت کر رہا ہوں۔ دل میں بڑا دکھ ہے۔ اگر یہ دکھ کبھی دور ہو گیا تو میں تمہیں شائد پیار کر سکوں گا اور تب شائد تمہیں حفاظت سے رکھوں گا“

اس غم آگیں محبت آمیز بات کی قیمت کتنے لوگ سمجھ سکتے ہیں؟ نلنی بڑی عقلمند ہے۔ وہ شوہر کے غم کو سمجھ گئی۔ پتی اس سے پریم نہیں کرتے۔ یہ بات اس نے انہیں کے منہ سے سنی۔ مگر پھر بھی وہ روٹھی نہیں۔ اس نے غرور نہیں کیا۔ بیوقوف لڑکی! سولہ سال کی عمر میں اگر نہ روٹھے گی نہ غرور کرے گی تو پھر کب کرے گی؟ لیکن نلنی نے سوچا روٹھنا۔ غرور کرنا۔ پہلے ہے یا پتی پہلے ہے۔؟

اس وقت سے اس کی فکر کا یہ واحد موضوع ہو گیا کہ کسطرح شوہر کا غم دور ہو۔ کیا کرنے سے پتی سوت کو بھول سکتے ہیں۔ اس بات کو اس نے ایک بار کے لئے بھی نہیں سوچا۔ درد کا اگر کوئی شریک

درد ہو۔ تکلیف میں اگر کوئی ہمدردی کا اظہار کرے اگر کوئی غم کی بات شوق یا دلچسپی کے ساتھ سنے۔ تو شائد اس کے مثل دنیا میں اور کوئی دوست نہیں۔

اس کے بعد ستیندر اکثر نلنی کو اپنی پہلے کی باتیں سنایا کرتا۔ دونوں کی کتنی ہی راتیں اسی ایک ہی طرح کی باتیں سنتے سناتے گذرنے لگیں۔ ستیندر ہی صرف باتیں کہتا تھا۔ ایسی بات نہ تھی۔ نلنی بھی شوق کے ساتھ پتی کی سابق بیوی کی محبت کی باتیں سننا پسند کرتی تھی۔

(۵)
دو سال بعد

دو برس بیت گئے۔ اب نلنی اٹھارہ سال کی ہو گئی۔ اب اسے پہلی سی تکلیف نہیں ہے۔ اب پتی اس کی ناقدری نہیں کرتے۔ پتی کی محبت کو اس نے زبردستی حاصل کر لیا ہے جو زور و زبردستی سے لینا جانتا ہے وہ اسے رکھنا بھی جانتا ہے۔ اب اسے کوئی بھی تکلیف نہیں ہے اس وقت ستیندر ناتھ بینا کا ڈپٹی مجسٹریٹ ہے۔ بیوی کی قدر و محبت اور خدمت گذاری کے باعث اس میں بہت کچھ تغیر واقع ہو گیا ہے۔ کچہری کے کام کے بعد وہ نلنی کے ساتھ بیٹھ کر غپ شپ کرتا ہے۔ مذاق کرتا ہے۔ اور گانا بجانا سن کر حظ اٹھاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ستیندر بہت کچھ آدمی بن گیا ہے۔ انسان کو جو چیز نہیں ملتی۔ وہ اس کے لئے نہایت پیاری چیز ہو جایا کرتی ہے۔ انسان کی فطرت

ہی ایسی ہے۔ تم مضطرب ہو سکون تلاش کرتے پھرتے ہو۔ میں سکون سے دن گذار رہا ہوں۔ پھر بھی نہ جانے کہاں سے اضطراب و پریشانی کو کھینچ لے آتا ہوں۔

پردۂ مکرو فریب کو چاک کرنا گویا انسان کا فطری جذبہ ہے جو مچھلی بھاگ جاتی ہے، کیا وہ ہی بڑی ہوتی ہے؟ ستیندر بھی آدمی ہے۔ آدمی کی فطرت کہاں جدا ہو سکتی ہے؟ اتنے پیار، اتنی قدر و عزت اتنی محبت اور اتنے سکون اور اطمینان کے باوجود اس کے دل میں کبھی کبھی بے اطمینانی کی بجلی تڑپ اٹھتی۔ بیک لمحہ دل کے اندر بجلی کے عمل کی طرح جو انقلاب سا برپا ہو جایا کرتا ہے۔ اسے سنبھالنے میں نلنی کو کافی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ درمیان درمیان میں اسے معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کے سنبھالے نہ سنبھالا جائے گا۔ شائید اتنے دنوں کی کوشش و کاوش اور لگن سب کچھ بے نتیجہ ہو جائے گا۔ نلنی کی ذرا سی خرابی کو بھی دیکھ کر ستیندر سوچتا۔ سرلا ہوتی تو شائید ایسا نہ ہوتا۔ ہوتا بھی یا نہیں۔ اسے تو بھگوان ہی جانتے ہیں۔ شائید نہ بھی ہوتا۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس کا چوگنا بھی ہوتا۔ مگر اس سے کیا؟ وہ مچھلی جو بھاگ گئی ہے! ستیندر اب بھی سرلا کو بھول نہیں سکا ہے۔ کچہری سے آتے ہی اگر اسے نلنی نہ دکھائی دی تو فوراً سوچتا۔ کہاں وہ اور کہاں یہ!

نلنی نہایت عقلمند ہے۔ وہ ہمیشہ شوہر کے پاس رہتی ہے۔ اس کی وجہ اسے معلوم ہے۔ کہ اب بھی وہ سرلا کو بھولے نہیں ہیں ایسی خواہش بھی نلنی کے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوتی کہ یکبارگی وہ اسے بھول جائیں۔ مگر ہاں فضول ہی یاد کر کے تکلیف اٹھاتے ہیں۔

اسی لئے وہ ہمیشہ ان کے پاس رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ نہ بھولیں۔ مگر اس کی تو وہ ناقدری نہیں کرتے۔ یہی نلنی کیلئے کافی ہے
گوپی کانت رائے ہیما کے ایک معزز وکیل ہیں کلکتے میں ان کا مکان نلنی کے گھر کے پاس ہے۔ کسی رشتے کی بنا پر نلنی انہیں کاکا کہتی ہے اور ان کی بیوی کو کاکی۔ رائے کاکی اکثر اس کے گھر آیا کرتی ہے گوپی بابو بھی اکثر آجایا کرتے ہیں۔ گاؤں کے ناطے گیا سسر کو ستیندر بہت مانتے ہیں۔ ستیندر کا مکان ان کے مکان سے دور ہو جانے کے باوجود دونوں گھرانے میں کافی میل جول ہو گیا ہے۔

نلنی بھی بیچ میں کاکا کے یہاں چلی جایا کرتی ہے۔ کیونکہ ایک تو کاکا کا گھر اور دوسرے ان کی لڑکی ہیما کے ساتھ اس کا کافی ربط ہے۔ بچپن کی سہیلی جو ٹھہری۔ دونوں کو ایک دوسرے کو نہیں چھوڑنا چاہتیں۔ اس روز بارہ بج گئے تھے۔ ستیندر ناتھ کچہری چلے گئے تھے۔ کوئی کام نہ دیکھ کر نلنی تصویر بنانے بیٹھ گئی۔ مگر اسی وقت ایک گاڑی گڑگڑاتی ہوئی ڈپٹی صاحب کے مکان کے سامنے آلگی۔

"کون آیا ہوگا؟ ہیما ہوگی؟" آگے نہ سوچنا پڑا۔ نہایت شور و شغب کر کر ہیما لگنی آکر کھڑی ہوگئی۔ ہیما نے سیدھے آکر نلنی کے بال پکڑ لئے۔ بولی۔ اب زیادہ لکھا پڑھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اٹھو ہمارے یہاں چلو۔ کل بھیا کی بہو آئی ہے۔ نلنی نے کہا بہو آئی ہے۔ ساتھ لیتی کیوں نہیں آئیں ہیما بولی یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ نئی نئی آئی ہے۔ ایکا ایک تیرے یہاں کیسے چلی آتی؟"
نلنی نے کہا۔ "تو میں ہی کیوں جانے لگی؟

ہیما گنگنی ہنس کر بولی "تو تو جائے گی سر کے بل۔ میں ابھی گھسیٹ کر لئے چلتی ہوں۔"

بال پکڑ کر کھینچ لے جانے پر نلنی ہی پر کیا منحصر ہے جو بھی ہوتا ہے اسے جانا پڑتا۔ چنانچہ نلنی کو بھی جانا پڑا۔

نلنی کو جانے میں خاص اعتراض تھا۔ کیونکہ ہیما کے گھر جانے کے بعد لوٹنے میں بہت دیر ہو جایا کرتی ہے اور ایک روز تو ایسا ہو گیا ہے کہ نلنی کے گھر لوٹنے کے قبل ہی ستیندر ناتھ کچہری سے آ گئے ہیں۔ ایسی صورت میں ستیندر کو بڑی دقت ہوتی ہے۔ وہ کچھ خیال کریں یا نہ کریں۔ مگر نلنی کو بڑی شرم معلوم ہوتی ہے کیونکہ نلنی کو معلوم ہے۔ کہ کچہری سے لوٹنے کے بعد اس کے ہاتھ سے پنکھے کی ہوا کھائے بغیر اس کے شوہر کی گرمی دُور نہیں ہوتی۔ ایشور کی مرضی بہت کوشش کرنے کے باوجود آج نلنی سات بجے سے پہلے گھر نہیں لوٹ سکی۔ گھر آکر اس نے دیکھا۔ ستیندر اخبار پڑھ رہا ہے اب تک اس نے کھایا پیا بھی نہیں۔ کھلانے کا انتظام نلنی نے اپنے ہی ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ پاس پہنچنے پر ستیندر ہنسا۔ مگر وہ ہنسی نلنی کو اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ وہ اندر سے کانپ اٹھی نلنی نے آسن بچھا کر ناشتہ کرانے کی کوشش کی۔ مگر ستیندر نے کچھ چھوا تک نہیں۔ بالکل بھوک نہیں ہے۔ بہت منانے پر بھی اس نے کچھ نہیں کھایا۔ نلنی سمجھ گئی۔ کیوں ایسے روٹھ گئے ہیں۔"



(۶)
کیا تقدیر پھوٹ گئی؟

آج ہیما نگنی اپنے سسرال جائے گی۔ اس کے شوہر اور بپیندر بابو لینے آئے ہیں۔ نلنی بہت دنوں سے ہیما سے ملنے نہیں گئی۔ اسی سے ہیما نے بڑے غم کے ساتھ اسے آنے کے لئے لکھا ہے۔

نلنی نے عہد کیا تھا کہ شوہر کے حکم کے بغیر اب وہ کہیں بھی نہ جائیگی۔ لیکن اگر آج وہ اس عہد کی حفاظت رکھتی ہے تو پیاری سکھی کے ساتھ اس کی ملاقات نہیں ہوتی۔ نلنی بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہیما نے لکھا ہے۔ تین بجے کی گاڑی سے روانہ ہونا ہے۔ تب شوہر کا حکم کیسے؟

بہت بحث مباحثہ کرنے کے بعد نلنی نے جانے ہی کا فیصلہ کیا جاتے وقت وہ داسی سے کہہ گئی کہ ٹھیک تین بجے راٹے بابو کے یہاں گاڑی پہنچ جانی چاہیئے۔ گاڑی بھیجی بھی گئی۔ مگر تین بجے کی گاڑی سے نہ جانا ہوسکا۔ لہذا اس نے نلنی کو کسی طرح بھی نہیں چھوڑا؟ بہت ضد کرنے پر بھی وہ ہیما کے ہاتھ سے بچ کر نہ آسکی ہیما آج بہت دنوں کے لئے چلی جارہی ہے۔ نہ جانے پھر کتنے دنوں کے بعد ملاقات ہوگی۔ آسانی سے کیسے چھوڑ دے؟

نلنی کو یہ بات کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتی تھی کہ گھر لوٹنے میں دیر ہو جانے سے شوہر ناراض ہوں گے اور پھر اس بات کو

بآسانی کہنا کون چاہتا ہے؟ اتنی ذلّت کون قبول کر سکتا ہے؟ خصوصاً اس عمر میں! آخر میں یہ بات بھی اس نے کہہ دی۔ لیکن ہیما نے اس پر یقین ہی نہیں کیا۔ اس نے ہنس کر کہا "مجھے بیوقوف نہ سمجھنا۔ ناراضی واراضی کی بات میں خوب سمجھتی ہوں اور ستیندر بابو بھی بہت ناراض ہونا جانتے ہیں۔

ہیما نے اس کی بات ہنسی میں اڑا دی مگر نلنی کو دلی تکلیف ہوئی۔ کیا سب کے شوہر ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوتے ہیں؟ کیا سبھی اوپیندر بابو کی طرح ہیں۔

نلنی جب گھر لوٹی۔ تو رات کے دس بج چکے تھے۔ گھر آ کر اس نے سنا۔ بابو باہر سو گئے ہیں!

ماتنگنی عرف ماتو۔ نلنی کے میکے کی نوکرانی ہے۔ وہ نلنی سے نہایت محبت کرتی ہے۔ اسی لئے آج اس نے نلنی کو دس بیس سخت باتیں سنا دیں۔ گھر بھر میں صرف اسی کو یہ بات معلوم تھی کہ ستیندر نے بہت غصہ ہو کر باہر کے کمرے میں بستر بچھانے کا حکم دیا ہے۔ گہری رات میں جبکہ بستر پر پڑا ہوا ستیندر آنکھیں نیچے ماضی کی یاد کو تازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور یہ سوچ رہا تھا کہ بہت دنوں سے غائب کھلے ہوئے کنول جیسے سرلا کے اس مکھڑے سے نلنی کا چہرہ کچھ ملتا جلتا ہے یا نہیں اور جب اس کے دل میں سرلا کی محبت کے پیش نظر نلنی کی محبت کو سمندر کے سامنے گئو شا کے کا پانی سمجھنے کی آندھی بہہ رہی تھی تب آہستہ سے دروازہ کھول کر نلنی اس کمرے میں داخل ہوئی۔ ستیندر

آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ نلنی ہے۔ نلنی آکر اس کی پائینتی بیٹھ گئی۔ ستیندر نے آنکھیں مینچ لیں۔ اسی طرح بہت دیر ہو گئی۔ یہ دیکھ کر ستیندر ناراض ہو گیا۔ اس نے کروٹ بدل کر مردانے انداز سے صاف طور پر کہا۔ "تم یہاں کیوں؟"

نلنی رو رہی تھی کچھ بول نہ سکی۔ روتے دیکھ کر ڈپٹی صاحب کچھ اور خشمگین انداز سے بولے۔ "کافی رات جا چکی ہے۔ جاؤ اندر جا کر سو رہو۔"

نلنی رو رہی تھی۔ اب کی بار اس نے افسوس خشک کرتے ہوئے کہا "تم بھی چلو نہ سونے۔"

ستیندر نے سر ہلا کر کہا۔ "مجھے بڑی نیند آ رہی ہے۔ اب نہیں اٹھ سکتا۔"

ستیندر رونے سے ناراض ہوتا ہے۔ نلنی نے آنکھوں کے آنسو پونچھ لئے ہیں۔ اب وہ شوہر کے سامنے نہیں روئے گی اس نے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا۔ "اب کی بار مجھے معاف کر دو۔ یہاں تمہیں بڑی تکلیف ہو گی۔ اندر چلو۔"

ستیندر نے عہد کر لیا ہے۔ اب وہ اندر نہ جائے گا اس نے کہا۔ "اتنی رات گئے تکلیف کی سوچنے کی ضرورت نہیں۔ تم سوؤ میں بھی سو رہا ہوں۔"

نلنی ستیندر کو پہچانتی تھی۔ اس نے اپنے کمرے میں جا کر ساری رات روتے ہوئے گذاری۔ کہاں گئی ہیمانگنی۔ ایک بار دیکھ کیوں نہیں جاتی۔ ناراضی وار اضی کی بات تو خوب سمجھتی ہے کیا اب

وہ اس جھگڑے کو مٹا دے گی؟"

دوسرے روز بھی ستیندر گھر کے اندر نہیں گیا نہ نلنی سے ملاقات کر سکا۔

نلنی نے ایک خط لکھ کر ماتو کے ہاتھ بھیجا۔ ستیندر نے اسے بغیر پڑھے ہی پھاڑ کر پھینک دیا۔ اور کہا "یہ سب اب نہ لانا"

چار پانچ روز بعد ایک روز نلنی کے بڑے بھائی نریندر بابو بنبا آ پہنچے۔ یکایک بھیّا کو دیکھ کر نلنی بہت خوش ہوئی مگر اس سے کہیں زیادہ وہ حیران ہوئی۔

نریندر بابو نے نلنی سے مل کر ہنستے ہوئے کہا "گھر چلنے کیلئے تو اس قدر بے چین کیوں ہو رہی ہے بہن؟"

"بے چین"

اس بات کا مطلب نلنی اسی وقت سمجھ گئی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا "تم لوگوں کو بہت دنوں سے دیکھا جو نہیں"

(۷)

پھوٹ گئی

جس روز شوہر کے قدموں میں پر نام کر کے نلنی اپنے بھیّا کے ساتھ گاڑی پر سوار ہو کر چلی گئی۔ اس روز رات کو ستیندر ناتھ ذرا بھی نہ سو سکا۔ وہ رات بھر سوچتا رہا۔ اتنا نہ کرنے سے بھی کام چل جاتا۔ بہت رات تک اس کے جی میں آتا رہا اب بھی وقت

ہے۔ اب بھی گاڑی لوٹا لائی جا سکتی ہے مگر ہائے غرور! اسی کے سبب نلنی کو واپس نہ لایا جا سکا۔"

جاتے وقت ماتو بھی نلنی کے ساتھ گئی صرف وہی اس وداع کی وجہ سے واقف تھی۔ نلنی نے ماتو کو خاص طور سے منع کر دیا کہ وہ گھر میں اس بات کا قطعی ذکر نہ کرے۔ نلنی نے سوچا اس بات کو ظاہر کرنے سے شوہر کی توہین ہوگی۔ اچھے ہوں چاہے بُرے۔ اس کے شوہر کو لوگ برا کہنے والے ہوتے کون ہیں؟"

میکے پہنچ کر نلنی نے ماتا پتا کے چرنوں میں پرنام کیا۔ چھوٹے بھیّا کو گود میں اٹھا لیا۔ سب کچھ کیا مگر وہ ہنس نہ سکی۔

ماں نے کہا "میری نلنی ایک ہی دن کی گاڑی کی تھکن سے سُوکھ گئی ہے"۔ مگر وہ سوکھا چہرہ پھر نہ کھلا۔

دنیا میں اکثر دیکھا جاتا ہے۔ کہ کسی معمولی وجہ سے بھی بہت بڑی خرابی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ صروپ نکھا کی معمولی شوخی و بیبا کی سونے کی لنکا کی تباہی کا سبب بن گئی۔ ایک معمولی کشش حسن کے باعث ٹرائے شہر برباد ہو گیا۔ راجہ ہریش چندر نہایت ہی معمولی وجہ سے مصیبت میں مبتلا ہوئے تھے۔ دنیا میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ہے۔

یہاں بھی ایک ذرا سے غُرور کے سبب سخت مصیبت ٹوٹ پڑی۔ ستیندر ناتھ کو کیا قصوروار ٹھیرایا جائے۔

نلنی نے کبھی غرور نہیں کیا۔ شوہر کی تکلیف کی بات یاد کر کے وہ چپ چاپ سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ مگر اب اس

سے برداشت نہ ہو سکا۔اس نے سوچا۔اس چھوٹی سی بات پہ وہ شوہر کے ذریعے تیاگ دی جائے۔اس سے تو بہتر ہے کہ وہ مر کیوں نہیں جاتی؟

سخت غرور سے نلنی سوکھنے لگی۔ادھر ستیندر کا غرور مٹ چکا ہے۔ایک گھڑی رہے بغیر جس کا کام نہیں چلتا۔اس کا یہ جھوٹا غرور کے دن قائم رہ سکتا ہے؟غرور سخت تکلیف کا سبب بن گیا ہے۔ستیندر ہر روز انتظار دیکھتا رہتا ہے۔شائید آج نلنی کا خط آئے گا۔شائید وہ لکھے گی کہ "مجھے آکر لواجاؤ" ستیندر سوچتا تب تو سر آنکھوں پر لے آؤں گا۔اب کسی طرح کا غیر مناسب سلوک نہ کروں گا۔مگر قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے جو ہونا ہے۔وہی ہو گا تم اور ہم محض ایک معمولی انسان بھر ہیں آج کل کرتے ہوئے چھ مہینے گذر گئے۔بد قسمت نے کوئی بات بھی نہیں لکھی۔پاپی ستیندر نا تھ لوٹ گیا۔مگر جھکا نہیں۔چھ مہینے بیت گئے۔رفتہ رفتہ ستیندر کیلئے ناقابل برداشت ہو گیا۔دبا ہوا غرور پھر ابھر آیا۔اور اب اس میں غصہ بھی آکر شامل ہو گیا۔ستیندر میں برے بھلے کی تمیز باقی نہ تھی۔اس لئے اسے اپنا قصور دکھائی نہ دیا وہ سوچنے لگا جیسے اس قدر غرور ہے اس سے ویسا ہی انتقام لینے کی بھی ضرورت ہے۔

کسی کو اپنا قصور نہ نظر آیا۔دونوں نصف ملے ہوئے دل پھر ہمیشہ کے لئے الگ ہو چلے۔شباب کے دور آغاز میں سمٹی ہوئی بیل کو کس نے کھینچ کر بڑھایا تھا؟مگر اب برداشت نہیں ہوتا۔

اب تو ٹوٹنے کی نوبت آپہنچی ہے۔

ستیندر ناتھ! تمہیں قصور وار نہیں ٹھیراتا۔ اس کو ٹھیرایا بھی نہیں جا سکتا۔ دونوں ہی نے غلطی کی ہے۔ قصور نہیں کیا اس بات کو بھگوان ہی جانتے ہیں۔ کہ غلطی دکھا دینے سے پیشمانی کس کو زیادہ ہوتی۔ ہم بھی نہ سمجھ سکتے۔ اور نہ تمہاری ہی سمجھ میں کچھ آتا۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ کس آرزو۔ کس شوق کی تکمیل کے لئے تم لوگوں نے اتنا کر ڈالا۔

شوق نہیں مٹتا۔ مٹانے کی خواہش بھی نہیں۔ کیا شوق ہے وہ بھی شائد اچھی طرح سمجھ نہیں سکتا پھر بھی درد مند دل نہ جانے کیسی ایک تشنہ آرزو کے باعث ہر وقت نالے اور فریاد و فغاں سے لبریز رہتا ہے کیا ہوا کرتا ہے۔ اس بے مقصد خطے میں اس طرح کی غیر مرئی حرکت کیوں جاری رہتی ہے۔ کسی طرح بھی اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔ خواہش ہونے پر بھی۔ دل کے ساتھ جنگ کرنے پر بھی۔ تمہیں جرم سے نجات دوں گا کیا دوں گا؟

(۸)

سہاگ رات

ایسی حسین و جمیل لائق اور ہونہار بہو ہے پھر بھی لڑکے کو پسند نہیں آئی۔ مالکن کو بہت صدمہ ہے یہ سوچ کر وہ نہایت اداس ہو رہی ہیں کہ ایسی چندے آفتاب اور چندے ماہتاب بہو کے آنے پر بھی وہ گھر گرہستی نہ

کرسکیں ۔ ماں کی سینکڑوں کوششوں کے باوجود لڑکے کا دل نہ پھرا۔ اب دوسری صورت ہی کیا ہے؟ "لڑکے ہی کو اگر پسند نہ آئے تو پھر بہو کیسی؟ "لڑکے کے پریم ہی سے تو بہو کا پریم ہے! اور میرا بھی اس میں کیا ہاتھ ہے۔ خود دیکھ بھال کر بیاہ کرلے تو کیا میں روک سکتی ہوں؟ وغیرہ شیریں فقروں کو دہراتے دہراتے اپنی مشق کے مطابق وہ "برن ڈالا" (دولہا دولہن کا خیر مقدم کرنے کے لئے آرتی کے سامان) سجانے بیٹھ گئیں۔

دو سال پہلے ہردیو بابو کا انتقال ہو چکا ہے اس کی بات یاد آگئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر نلنی کی یاد آگئی آنسوؤں کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ کیا جانے کیسی بہو آئے گی ستیندر کے باپ ہوتے تو شاید ابھاگنی کو ایسی حالت نہ دیکھنی پڑتی۔

ستیندر بیاہ کر کے آگیا۔ ماں نے "برن" (خیر مقدم) کر کے دونوں کو گھر میں لیا۔ جلی آنکھوں میں پھر پانی بھر آیا۔ انہوں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "آنکھوں میں کچھ پڑ گیا ہے۔ بار بار پانی آجاتا ہے۔"

گری بالا بڑی منہ پھٹ لڑکی ہے۔ خاص کر نلنی کے ساتھ اس کا بہناپا تھا۔ وہ کہہ بیٹھی۔ "اس عمر میں تین بار تو ہو چکا اور بھی کتنی بار کیا کیا پڑے گا کون جانتا ہے؟"

بات انہوں نے سن لی۔ ستیندر کے بھی کانوں تک پہنچ گئی۔ کل شوق کی سہاگ رات ہے۔

نہ جانے کہاں سے بڑے ٹھاٹ باٹ کے ساتھ بھاری بھر کم سوغات آئی ہے دولہا دولھن کیلئے ڈھاکے کی ساڑھی، دھوتی چادر وغیرہ بہت

اچھی اچھی چیزیں ہیں۔ اس میں دولھن کے لئے جیسی بنارسی ساڑھی آئی ہے۔ ویسی خوبصورت ساڑھی اس کے پہلے اس گاؤں میں کبھی کسی نے دیکھی تک نہیں سبھی پوچھ رہے ہیں" کہاں کی سوغات ہے؟ ماں بار بار منہ پھلا کر کہہ دیتی ہے ستیندر کے کسی دوست نے بھیجی ہے"

ماں نے آنکھوں کے آنسو دبا کر اصل خبر کو چھپاتے ہوئے ہنستے روتے چہرے سے سوغات کی مٹھائی وغیرہ تقسیم کرادی۔

سب اپنا اپنا حصہ لے کر چلی گئیں۔ جاتے وقت راج بالا نے کہا۔ "اچھی سوغات ہے"۔ نرنگالی نے کہا " کیوں نہ اچھی ہوگی؟ بڑے آدمیوں کے ہاں سے ایسی ہی سوغات آیا کرتی ہے"۔

رفتہ رفتہ جب یہ بات دب گئی تو یوگ مایا بولی " اچھا بھرت شادی کیوں کی؟ گیان وا نے کہا " کیا جانیں بہن! ایسی حسین اور لائق بہو تھی۔ کیا معلوم۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا"

رام منی نائی کی لڑکی ہے اس کی حالت اچھی ہے۔ دیکھنے میں بھی بری نہیں ہے ہاں ذرا ناک چپٹی ہے۔ بعض حسد کرنے والے اس کی آنکھوں میں بھی عیب نکالتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ہاتھی کی آنکھوں سے بھی چھوٹی آنکھیں ہیں"

خیر جانے دو۔ اس عیب جوئی سے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔ رام منی نے ذرا ہنس کر کہا " تمہارے دماغ میں اگر عقل ہوتی تو کیا ایسی باتیں کرتی۔ وہ ہمیشہ قہقہہ لگا کر رک رک کر جو باتیں کرتی تھیں اس سے مجھے شبہ ہو گیا تھا۔ اس کے عادت و اخلاق اچھے نہیں تھے نئی بالکل چھپے نہ تھے۔ نہیں تو اس طرح نکال دیتے، اور پھر بیاہ کرتے!

منہ سے کسی کے کچھ نہ کہنے پر بھی بہتوں کی رائے سے اس کی رائے مل گئی۔

اس کے دو ایک روز بعد گاؤں کے تقریباً تمام آدمی جان گئے کہ رام منی نے زمیندار کے گھر کا خاص راز معلوم کر لیا ہے، نائی کی لڑکی نہ ہوتی تو کیا اتنی عقل برہمن کائستھ میں ہو سکتی ہے؟ بہتوں نے بات منظور کر لی۔"

اب ماں کی باری ہے یہ بات جب ان کے کان تک پہنچی تو وہ گھر کے کواڑ بند کر کے اکبارگی زمین پر لوٹنے لگیں، میری نلنی بدعفت ہے معلوم نہیں کیوں وہ سرلا کے مقابلے میں نلنی سے زیادہ پریم کرنے لگی تھیں۔ زندگی بھر کے لئے اس نلنی کی تقدیر پھوٹ گئی تھی۔ ماں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ستیندر رکھے تو اچھا ہی اچھا ہے نہیں تو میں اسے لے کر کاشی باس کروں گی۔ ابھاگنی کی اس جنم کی تمام آرزوئیں ختم ہو گئیں تو انہوں نے کواڑ کھول کر مالتو کو پاس بلا کر کواڑ بند کر لئے۔ مالتو ہی سوغات لے کر آئی تھی۔

دونوں میں آنسوؤں کا کافی تبادلہ ہوا۔ کس طرح نلنی کا سنہرا رنگ سیاہ ہو گیا ہے۔ کس جرم کی بنا پر ستیندر نے اسے پیروں سے ٹھکرایا ہے۔ کتنے پُر درد لفظوں میں اس نے ساس کو پیرنام کہلایا ہے وغیرہ تفصیل ماتنگنی نے خوب اچھی طرح آہستہ آہستہ آنسو پونچھتے ہوئے کہہ سنایا۔ سنتے سنتے ماں کا پہلا پریم سوگنا بڑھ گیا اور بیٹے کے متعلق سخت خفگی پیدا ہو گئی۔ دل ہی دل میں وہ سوچنے لگیں "کیا میں ستیندر کی کوئی بھی نہیں ہوں۔ کیا میری سبھی باتیں نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں

کیا میری ایک بات بھی نہیں رہے گی؟ میں پھر نلنی کو گھر لاؤں گی میری مچھمی کی کیا ایسی خراب حالت ہونی چاہیئے۔

اسی روز شام کو ماں نے بیٹے کو بلا کر کہا "نلنی کو لے آؤ"

بیٹے نے سر ہلا کر کہا "نہیں"

ماں رودین بولیں "اورے۔ میری نلنی کے نام پر گاؤں بھر میں کلنک پھیل رہا ہے تو اس کا پتی ہے۔ اس کی عزت نہ رکھے گا؟ کیسا کلنک اس طرح سے نکالا ہے اور پھر بیاہ کر لینے سے میں کس کس کا منہ بند کر سکتی ہوں۔

منہ بند کر کے کیا ہو گا؟ تو نہ لائے گا؟

"نہیں"

ماں بہت ناراض ہوگئیں یہ وہ پہلے ہی سے طے کر آئی تھیں کہ کیسے غصہ ہونا ہو گا اور تب کیسی کیسی باتیں کہنی ہوں گی لہذا کچھ سوچنا نہ پڑا۔ بولیں "تو کل ہی مجھے کاشی بھیج دے۔ میں یہاں ایک پل بھی نہیں رہنا چاہتی"

ستیندر اب وہ ستیندر نہیں رہا۔ سرلا کی قدر و محبت کی دولت، کھیل کی چیز، شوق کا سامان، افسردگی، بلند خیالی۔ سادہ دلی، خندہ روشوہر نلنی کا طرح طرح کی سعی و کوشش اور گوناگوں تکلیف و مصیبت سے من چاہا بنا ہوا ستیندر اب نہیں رہا۔

اس نے بھی سینے پر پتھر رکھ لیا ہے۔ شرم و حیا اور برے بھلے سب کا خیال اس نے ترک کر دیا ہے۔ اس لئے بے دلی سے کہا "تمہارا جہاں جی چاہے چلی جاؤ۔ میں اب کسی کو بھی نہیں لا سکتا"

ماں کو خواب میں بھی اس کا خیال نہ تھا کہ ستیندر کے منہ سے انہیں ایسی، بات سننی پڑے گی۔ وہ روتی ہوئی چلی گئیں جاتے وقت کہتی گئیں "میری بہو بد چلن نہیں ہے یہ اچھی طرح جان رکھنا۔ گاؤں کے لوگ خواہ کچھ کہا کریں۔ لیکن میں اس بات پر ہرگز یقین نہ کرونگی

دوسرے روز بُواجی نے ستیندر کو بلا کر کہا "تمہارے ایک دوست نے تمہارے لئے سوغات بھیجی ہے۔ دیکھا ہے؟"

ستیندر نے گردن ہلائی بولا "نہیں تو۔ کس دوست نے؟"

"معلوم نہیں، بیٹھو، سب کپڑے لے آؤں؟"

تھوڑی دیر بعد بُواجی ایک بنڈل لے کر آئیں۔ ستیندر نے دیکھا کہ بہت قیمتی کپڑے ہیں۔ وہ حیران ہو گیا کس دوست نے بھیجے ہیں؟

بنارسی ساڑھی کو غور سے دیکھتے ہوئے اس نے ایک کونے میں کچھ بندھا ہوا پایا۔ کھول کر دیکھا تو وہ ایک چھوٹا سا خط تھا۔

دستخط دیکھ کر ستیندر کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس میں لکھا تھا:

"بھیّن! پریم کی سوغات واپس نہ کرنی چاہیئے۔ تمہاری چچی نے جو بھیجا ہے اسے قبول کرو۔"

× × × ×

اس سہاگ رات کا پھول کا بستر ستیندر کے لئے کانٹوں کی سیج بن گیا۔"

(۹)
نریندر بابو کا خط

کیا نوجوان کا سا غرور کسی بچے میں دیکھا ہے؟ کیا ستیندر کی طرح غرور کر کے اتنا بڑا فساد کرتے ہوئے کسی بچے کو دیکھا ہے؟ بچپن میں کتاب لے کر کھیل کیا کرتا تھا تو باپ نے اس کی سزا دی ہے اور میں نے بھگتی ہے ستیندر ناتھ! تم نے دل سے کھیلا ہے کیا اس کی سزا سے ڈرتے ہو؟"

تم لوگ نوجوان ہو، ساری دنیا تمہارے لئے گہوارہ وعیش وراحت ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ کیا تم میں سے کسی پر ایسا وقت نہیں آیا ہے جب زندگی واقعی ایک بار سی معلوم ہوئی ہو؟ جب جسم کے تمام اعضا سست اور مضمحل ہو جاتے ہیں؟ اگر نہ موقع ملا ہو؟ تو ایک بار ستیندر کو دیکھو نفرت کرنے کا جی چاہے تو آزادی کے ساتھ نفرت کرو۔ نفرت کرو۔ ہمدردی نہ ظاہر کرنا۔ نفرت کرو کچھ کہے گا نہیں۔ رحم نہ کرنا۔ مرجائیگا پاپی اگر مر جائے تو اس کا کفارہ کون ادا کرے گا؟ ستیندر کی تھکی ہوئی زندگی کا ہر ایک دن ایک ایک ناقابل برداشت بار لے آتا ہے۔ دن بھر تڑپتے ہوئے بھی وہ اس بار کو اتار نہیں سکتا۔

ستیندر کو درمیان میں معلوم ہوتا ہے۔ گویا وہ اپنی ماضی کی زندگی کو بھول گیا ہے۔ اگر بھولا نہیں ہے۔ تو صرف اتنا کہ اس کی پیاری نلنی بینا میں بدچلن ہوئی تھی۔ اسی سے اس کے پتی نے اسے تیاگ دیا ہے۔"

ستیندر کی شادی کو تقریباً دو مہینے گذر چکے ہیں۔ آج ستیندر کو ایک خط اور ایک چھوٹا سا پارسل ملا ہے۔ خط نلنی کے بھائی نریندر بابو کا ہے۔ اور اس طرح ہے۔

ستین بابو!

حد درجہ ارادہ نہ رکھتے ہوئے بھی میں جو آپ کو خط لکھ رہا ہوں وہ صرف اپنی عزیز ترین بھین نلنی کے سبب، موت سے قبل۔ وہ بہت بہت طرح سے کہہ گئی ہے۔ یہ انگوٹھی آپ کے پاس دوبارہ بھیج دی جائے لہٰذا آپ کے نام کی انگوٹھی واپس بھیج رہا ہوں۔ میری بھین کی خواہش تھی۔ اس انگوٹھی کو آپ اپنی نئی بیوی کو پہنا دیں۔ امید ہے آپ اس کی اس خواہش کو پوری کریں گے۔ اور مرنے سے پہلے وہ آپ سے خاص طور پر منت کر کے کہہ گئی ہے۔ کہ اس کی چھوٹی بھین کو تکلیف نہ ہو۔"

"شری نریندر ناتھ!"

نلنی کے جب ایک بچہ ہو کر مر گیا تھا تو ستیندر نے اسے یہ انگوٹھی پہنا دی تھی۔ کیا ستیندر کو یہ بات یاد آئی تھی؟

اب ستیندر ناتھ بینا میں نہیں رہتے خواہ اس کی وجہ کچھ بھی ہو مال بھی کاشی باس نہ کر سکیں۔ نئی بیوی کا نام ہے ویدھو۔

ویدھو شائید پہلے جنم میں نلنی کی بھین تھی؟

مندر

(۱)

ایک گاؤں میں ندی کے کنارے کمہاروں کے دو گھر تھے۔ ان کا کام تھا ندی میں سے مٹی اٹھا کر سانچے میں ڈھال کر کھلونے بنانا اور ہاٹ میں لے جا کر انہیں بیچ آنا۔ ہمیشہ سے ان کے یہاں یہی کام ہوتا آیا ہے۔ اور اسی سے ان کے اوڑھنے پہننے کھانے پینے وغیرہ کی گذر ہوتی رہی ہے۔ عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ پانی بھرتی ہیں، رسوئی بنا کر شوہر بیٹے وغیرہ کو کھلاتی ہیں اور آنواں ٹھنڈے ہونے پر اس میں سے پکے کھلونے نکال نکال کر انہیں آنچل سے جھاڑ پونچھ کر رنگنے کے لئے مردوں کے ہاتھ کے آگے رکھ دیا کرتی ہیں۔

شکتی ناتھ نے انہیں کمہار خاندانوں کے درمیان آکر اپنے لئے ایک جگہ بنا لی تھی۔ یہ مرض زدہ، برہمن کمار اپنے دوست احباب کھیل کود۔ پڑھنا لکھنا۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک روز ایکا یک ان مٹی کے کھلونوں پر جھک پڑا۔ وہ پیچھے کی چھری دھو دیتا۔ سانچے کے اندر سے مٹی صاف کر دیتا۔ اور شوق و اضطراب کے ساتھ دیکھتا رہتا کہ کھلونوں کے خط و خال کس بے احتیاطی سے بنائے جاتے ہیں۔

سیاہی سے کھلونوں کی بھویں۔ آنکھیں، ہونٹ، وغیرہ رنگ دئے جاتے تھے کسی کی بھنویں موٹی ہو جاتیں تو کسی کی آدھی ہی بنتیں کسی کے ہونٹ کے نیچے سیاہی کا داغ لگ جاتا تو کسی کے کچھ۔ شکتی

ناتھ بیتابی کے ساتھ پرارتھنا کرتا۔ ”سرکار بھیّا۔ ایسی بے پروائی سے کیوں رنگ رہے ہو۔ سرکار بھیا۔ یعنی کاریگر پریم کے ساتھ ہنستا ہوا جواب دیتا۔ ”مہاراج جی اچھی طرح رنگنے میں پیسے زیادہ لگتے ہیں۔ اتنا دیتا کون ہے۔ بولو، ایک پیسے کا کھلونا چار پیسے میں تو نہیں بنے گا نہ؟“

(۲)

اس آسان بات کی کافی تنقید کرنے پر بھی شکتی ناتھ صرف آدھی ہی بات سمجھ سکے۔ ایک پیسے کا کھلونا ٹھیک ایک ہی پیسے میں بکے گا چاہے اس کی بھویں ہوں یا نہ ہوں۔ یا آدھی ہی ہوں۔ دونوں آنکھیں برابر ہا ہیں برابر چاہے جیسی ہوں وہی ایک پیسہ! کون فضول اتنی محنت کرے۔ لڑکے کھلونے خریدیں گے۔ دو گھڑی اس سے پیار کریں گے۔ سلائیں گے۔ بٹھائیں گے۔ گود میں لیں گے۔ اس کے بعد توڑ پھوڑ کر پھینک دیں گے۔ بس یہی تو؟

شکتی ناتھ گھر سے سویرے جو موڑی[۱] مڑکی[۲] دھوتی میں باندھ لایا تھا۔ اس کا کچھ حصہ اب بھی بندھا ہوا ہے اسی کو کھیل کر بہت ہی افسردہ سا ہو کر چبا تے چباتے اور بکھیرتے بکھیرتے وہ اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان کے آنگن میں آکھڑا ہوا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا، بوڑھے بیمار پتا زمیندار کے یہاں مدن موہن بھگوان کی پوجا کرنے گئے تھے۔ وہاں سے وہ بھیگے ارواچاول۔ کیلے، مولی وغیرہ چڑھایا ہوا نیویدر دیوتا کا بھوگ باندھ لائیں گے اس کے بعد پکا کر بیٹے کو کھلائیں گے

[۱] بھنے ہوئے نمکین چاول۔ [۲] مڑکی گڑ اور شکر میں پکی ہوئی کھیلیں۔

گھر کا آنگن کنڈ کری اور ہر سنگار کے درختوں سے بھرا ہوا ہے۔ بے مالکن کے مکان میں چاروں طرف جنگل دکھائی دیتا ہے کسی طرح کا سلسلہ نہیں۔ کسی چیز میں آرائش نہیں بوڑھے بھٹا چاریہ مدھوسو دن کس طرح کاٹتے ہیں۔ شکتی ناتھ۔ پھول توڑتا۔ شاخیں ہلاتا۔ اور پتیاں نوچتا ہوا سارے آنگن میں پریشان سا گھومنے پھرنے لگا۔

شکتی ناتھ روز صبح کمہاروں کے گھر جایا کرتا ہے آج کل اسے کھلونوں پر رنگ چڑھانے کا حق مل گیا ہے اس کا سرکار بھیا بڑی کوشش کے ساتھ سب سے اچھا کھلونا تراش کر اس کے ہاتھ میں دیتا اور کہتا۔ "تو مہاراج جی اسے تم رنگو"۔ مہاراج جی دوپہر تک اسی ایک کھلونے کو رنگتے رہتے۔ شائید خوب اچھا ہی رنگا جاتا۔ پھر بھی ایک پیسے سے زیادہ کوئی نہیں دیتا۔ لیکن سرکار بھیا گھر آکر کہتا۔ "مہاراج جی کا رنگا ہوا کھلونا دو پیسے میں بکا"۔ سن کر شکتی ناتھ خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا۔

(۳)

اس گاؤں کے زمیندار کائستھ ہیں۔ دوج دیوتا سے ان کو زبردست عقیدت ہے۔ خاندانی دیوتا مدن موہن کی تصویر بنوا رکھی ہے۔ پاس ہی شری رادھا کی سنہری تصویر ہے۔ یہ دونوں تصویریں ایک عالیشان مندر میں چاندی کے سنگھاسن پر رکھی ہوئی ہیں ان کے علاوہ بندرابن کی لیلا سے متعلق بہت سی حسین وجمیل تصویریں دیواروں پر زیب دے رہی ہیں اوپر کمخواب کا شامیانہ ہے۔ جس کے وسط میں سینکڑوں شاخوں والا جھاڑ لٹک رہا ہے ایک طرف سنگ مرمر

کے چبوترے پر پوجا کا سامان رکھا ہوا ہے اور پھول اور چندن کی خوشبو سے سارا مندر معطر ہو رہا ہے۔ شائید سورگ کی فرحت و لطافت کی یاد دلانے کیلئے پھول اور خوشبو کو پوجا کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ان چیزوں کی لطیف خوشبو نے مندر کی ہوا کو عطر آگیں بنا رکھا ہے۔

(۴)

بہت دنوں کی بات کہہ رہا ہوں۔ زمیندار راج نرائن بابو نے جب ادھیڑ بن کی حد میں قدم رکھتے ہی پہلے پہل سمجھا کہ اس زندگی کا سایہ بتدریج طویل اور دھندلا ہوتا جا رہا ہے۔ جس روز انہوں نے صبح پہلے پہل سمجھا کہ اس زمینداری اور دولت و جائیداد سے بہرور ہونے کی میعاد روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے پہل جس روز مندر کے ایک طرف کھڑے کھڑے انہوں نے آنکھوں سے پشیمانی کے آنسو بہائے ہیں اسی روز کی بات کہہ رہا ہوں۔ اس وقت ان کی اکلوتی بیٹی اپرنا پانچ برس کی بچی تھی۔ باپ کے قدموں کے پاس کھڑی ہو کر وہ دل لگا کر دیکھا کرتی۔ مدھوسودن بھٹاچاریہ مندر کے اس کالے کھلونے کو چندن سے رنگ رہے ہیں۔ پھولوں سے سنگھاسن بنا رہے ہیں اور اسی کی بہترین خوشبوئیں آشیرباد کی طرح گویا اسے چھوتی پھر رہی ہیں۔ اسی روز سے روزانہ وہ بچی شام کے بعد اپنے باپ کے ساتھ دیوتا کی آرتی دیکھنے آیا کرتی۔ اور اس جشن مسرت کے درمیان میں وہ بلاوجہ ہی خوشی میں ڈوب کر دیکھتی رہ جاتی۔

رفتہ رفتہ اپرنا بڑی ہونے لگی۔ ہندو گھرانے کی لڑکی جس طرح ایشور کے خیال کو دل میں جگہ دیا کرتی ہے اسی طرح وہ بھی دینے لگی،

اس مندر کو باپ کی نہایت احترام کی چیز جان کر اسے وہ اپنے خونِ دل کی طرح سمجھنے لگی اور اپنے ہر کام اور کھیل کود میں یہی ثابت کرنے لگی۔ دن بھر اسی مندر کے آس پاس موجود رہتی اور ایک بھی سوکھی گھاس کا تنکا یا سوکھا پھول مندر کے اندر پڑا رہنے دینا اسے برداشت نہیں ہوتا۔ کہیں ایک بوند پانی گر گیا تو اسے وہ اپنے آنچل سے پونچھ دیتی راج نرائن بابو کو دیوتا کے ساتھ جو دلدادگی تھی۔ لوگ اسی کو حد سے متجاوز سمجھتے تھے۔ لیکن اپرنا کی دیو سیوا اور محبت اس حد سے بھی تجاوز کرنے لگی۔ پرانے گلدان میں اب پھول نہیں سماتے ایک دوسرا بڑا گلدان منگایا گیا چندن کی پرانی کٹوری بدل دی گئی۔ بھوج اور نیوید کی مقدار پہلے سے بہت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ روزانہ نئی نئی قسم کی پوجا کے انتظام اور اس کے بے عیب انتظام کے جھگڑے نے بوڑھے پجاری تک کو پریشان کر ڈالا۔ زمیندار راج نرائن بابو یہ سب دیکھتے سنتے اور خوش ہو کر محبت سے کہتے "دیوتا نے میرے گھر خود اپنی خدمت کے لئے بچی کو بھیج دیا ہے۔ تم لوگ کچھ نہ کہو"

x x x x

(۵)

حسب موقع اپرنا کی شادی ہو گئی۔ اس اندیشے سے کہ مندر چھوڑ کر اب اسے کہیں دوسری جگہ جانا پڑے گا اس کے چہرے کی ہنسی نا وقت ہی سوکھ گئی۔ دن دکھلایا جا رہا ہے اسے سسرال جانا ہوگا پوری بجلی سینے میں دبائے بارش کے گھنگھور کالے بادل جس طرح گھیرے غرور و تمکنت کے اندرونی بوجھ سے ساکن کچھ دیر تک آسمان

میں برسنے کے لئے کھڑے رہتے ہیں۔ اسی طرح سکون و وقار کے ساتھ اپرنا نے ایک روز سنا کہ وہ دکھلایا ہوا دن آج آگیا ہے۔ اس نے پتا کے پاس جاکر کہا۔ "بابوجی، میں بھگوان کی خدمت کو جو بیکنٹھ بسنت گئے جاتی ہوں۔ اس میں کسی طرح کا فرق نہ آنے پائے"

بوڑھے باپ رو پڑے۔ بولے۔ سو تو بیٹی۔ نہیں کوئی فرق نہیں آئے گا"

اپرنا چپ چاپ چلی آئی۔ اس کے ماں نہیں ہے۔ وہ رو نہیں سکی۔ بوڑھے باپ کی دونوں آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں۔ وہ غصہ کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کے بعد جس طرح ایک بہادر سپاہی اپنے دردمند اور گریہ آگیں جبری دل پر ایک مردانہ خشک ہنسی کا پردہ ڈال کر جلدی سے گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو جاتا ہے اسی طرح اپرنا پالکی میں بیٹھ گئی۔ اور گاؤں چھوڑ کر لامعلوم فرض کی بجا آوری کو بسر و چشم قبول کر کے روانہ ہو گئی۔ اپنے مضطرب آنسوؤں کو خشک کرتے ہوئے اسے یاد آیا کہ اس نے باپ کے آنسو تو پونچھے ہی نہیں۔ اس کے دل نے روتے ہوئے بے پایاں شکائیتوں کا ایک دفتر کھول دیا۔ ایک تو اس کا دل یونہی سینکڑوں اندوہ و غم کا مرکز بنا ہوا تھا دوسرے نہ جانے کہاں گاؤں کے دور کے کسی مندر میں جب پوجا کے شنکھ اور گھنٹے بجنے لگے تو اس بچپن کی متعارف آرتی کی پکار نے اس کے کانوں سے گذر کر اس کے دل کو یاس و حسرت کا طوفان گاہ بنا دیا۔ اپرنا نے بے ساختہ پالکی کی کھڑکی کھول دی۔ وہ شام کے جھٹپٹے میں دیکھنے لگی اور گھنے سایہ دار دیودار کے ایک ایک درخت کی چوٹی پر ایک ستونا سا

مندر کی بلند چوٹی کا تصور کر کے وہ فرط جوش وہیجان سے بے اختیار رو پڑی۔ سسرال کی ایک خادمہ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی تھی اس نے جلدی سے پاس آکر کہا "چھی بہو جی کوئی اس طرح بھی روتا ہے؟ کون سسرال نہیں جاتا؟ اپرنا دونوں ہاتھ سے منہ ڈھک کر خاموش ہو گئی اور اس نے پالکی کے دروازے کو بند کر لیا۔

عین اسی وقت مندر میں کھڑے ہو کر بے تیا کے تپا راج نارائن کرشن بھگوان کے سامنے دھوپ کے دھوئیں اور آنسوؤں کے دھندلکے میں ایک غیر واضح دیوی مورت کے بے انتہا حسین وجمیل چہرے پر اپنی محبوب دوسری بیوی کے چہرے کا جمال دیکھ رہے تھے۔

x x x x x

(۶)

اپرنا شوہر کے گھر رہتی ہے وہاں اس کے اپنے افسردہ اور بے حس شوہر کی باتوں میں نام کو بھی نہ کسی طرح کا جذبہ و جوش نظر آیا۔ نہ کسی طرح کی شوخی و بیباکی کا اظہار ہوا۔ پہلی محبت اور ملاپ کی شرم وحیا اور جذبہ و جوش کسی چیز سے بھی اس کی افسردہ آنکھوں کی سابقہ چمک واپس نہ آسکی۔ شروع ہی سے شوہر اور بیوی کی باہم یہ حالت رہی۔ جیسے ایک دوسرے کے سامنے کسی نادانستہ جرم کے مجرم ہوں۔ اور اس کی اضطراب انگیز خلش ساحل کو توڑ کر پر جوش ندی کی طرح ایک ناقابل عبور خلیج بنا کر بہنے لگی۔

ایک روز بہت رات گئے امرناتھ نے آہستہ سے پکار کر کہا اپرنا! تمہیں یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا؟"

اپرنا جاگ رہی تھی۔ بولی "نہیں"۔

امر۔ "میکے جاؤ گی؟"

اپرنا۔ جاؤں گی۔"

امر۔ کل جانا چاہتی ہو؟"

اپرنا۔ ہاں جانا چاہتی ہوں"۔

امرناتھ جواب سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ کچھ دیر چپ رہ کر بولا "اور اگر نہ جانا ہو سکے؟"

اپرنا نے کہا "تو جیسے ہو۔ ویسے ہی رہوں گی"۔

پھر کچھ دیر دونوں ہی چپ رہے۔ امرناتھ نے بلایا "اپرنا"۔

اپرنا نے مضطرب انداز سے کہا "کیا ہے؟"

"کیا تمہیں میری کوئی ضرورت ہی نہیں؟"

اپرنا نے کپڑے سے سارا جسم اچھی طرح ڈھک کر آرام سے سوتے ہوئے کہا۔ "ان سب باتوں سے بڑا جھگڑا ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں نہ کرو۔

"جھگڑا ہوتا ہے کیسے جانا؟

"جانتی ہوں۔ میرے میکے میں منجھلے بھیا اور منجھلی بھابھی میں اسی بات پر روز کھٹ پٹ جایا کرتی ہے۔ مجھے جنگ اور کشمکش اچھی نہیں لگتی"۔

سن کر امرناتھ مشتعل ہو گیا۔ گویا وہ اندھیرے میں ٹٹولتا ہوا اسی بات کو تلاش کر رہا تھا اور جیسے یکایک آج وہ اس کے ہاتھ آ گئی ہو۔ وہ کہنے لگا "آؤ اپرنا ہم بھی جھگڑا کریں۔ یوں رہنے کے

مقابلے میں تو لڑائی جھگڑا لاکھ گنا اچھا۔"

اپرنا نے کہا "چھی ہم جھگڑا کیوں کریں گے۔ تم سو جاؤ۔"

اس کے بعد اس بات کو اپرنا سوئی یا جاگتی رہی۔ امرناتھ ساری رات جاگتے ہوئے بھی سمجھ نہ سکا۔

صبح سے لے کر شام تک اپرنا تمام دن کام کاج اور جپ تپ میں گذار دیتی۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں یہ دیکھ کر وہ عیش و تفریح اور ہنسی مذاق میں ذرا بھی حصہ نہیں لیتی۔ اسے نہ جانے کیا کیا کہتی رہتیں نندیں اسے "گوسائیں جی" کہہ کر اس کا مذاق اڑاتیں۔ پھر بھی وہ ان کے ساتھ مل جل نہ سکی۔ وہ بار بار یہی سوچتی کہ دن فضول ہی گذرے جا رہے ہیں اور یہ جو بے نتیجہ کشش ہے اس کے خون کا ہر قطرہ اس خاندانی مندر کی طرف بھاگ جانے کے لئے پور نماشی کی سمندر کی بیقرار لہروں کی طرح اس کے دل کے ساحل پر دن رات جو سر ٹیک رہا ہے۔ اس کو کیسے روکا جائے؟ گھر گرہستی کے کاموں سے یا چھوٹے موٹے ہنسی مذاق سے اس کا پراگندہ اور بیمار دماغ جو ایک زبردست توہم کا بوجھ اپنے اوپر لئے خود بخود چکر کھا رہا ہے۔ اس کے پاس تک شوہر کا پریم پیار اور اس کے قرابتداروں کی انس و محبت بھری باتیں کیسے پہنچیں؟

وہ کس طرح سمجھے۔ کہ ایک کمسن لڑکی کے دیو سیوا کا ذریعہ نسوانیت کے فرائض کے تمام گوشوں کو مکمل نہیں کیا جا سکتا۔"

(۷)

امرناتھ کی سمجھنے کی غلطی ہے وہ سوغات لے کر بیوی کے پاس آیا ہے۔ دن کے قریب نو دس بجے ہوں گے۔ نہانے کے بعد اپرنا پوجا کرنے جا رہی تھی۔ جہاں تک ممکن ہوا گلے کی آواز کو شیریں بنا کر امرناتھ نے کہا "اپرنا تمہارے لئے کچھ سوغات لایا ہوں کیا از راہ عنایت انہیں لو گی؟"

اپرنا نے مسکراتے ہوئے کہا کیوں نہ لوں گی؟"

امرناتھ کا دل باغ باغ ہو گیا گویا انہیں جنت ہاتھ آ گئی ہو۔ وہ خوش خوش خوبصورت رومال میں بندھے ہوئے ایک صوفیانہ بکس کا ڈھکن کھولنے بیٹھ گیا۔ ڈھکن کے اوپر سنہرے حرفوں میں اپرنا کا نام لکھا ہوا تھا۔ اب اس نے اپرنا کا چہرہ دیکھنے کے لئے ایک بار اس کے منہ کی طرف دیکھا۔ لیکن دیکھا کہ جیسے آدمی شیشے کی بنی ہوئی نقلی آنکھ لگا کر دیکھتا ہے اسی طرح اپرنا اس کی طرف دیکھ رہی ہے یہ دیکھ کر بیک لمحہ اس کی ساری مسرتوں پر پانی پھیر گیا۔ ذرا سے ایک خشک ہنسی ہنس دی اور شرم سے گڑ جانے کے باوجود اس نے بکس کا ڈھکن کھول کر کنسلین وغیرہ کی متعدد شیشیاں اور نہ جانے کیا کیا نکالنا شروع کیا۔ لیکن اپرنا نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "کیا یہی سب چیزیں میرے لئے لائے ہو؟ امرناتھ کی بجائے گویا اور کسی نے جواب دیا۔ "ہاں تمہارے ہی لئے لایا ہوں دل خوش کی شیشیاں...."

اپرنا نے پوچھا۔ "بکس بھی مجھے دے دیا گیا؟"

ضرور

تو پھر انہیں کیوں باہر نکال رہے ہو؟ بکس ہی میں رہنے دو۔"

"اچھی بات ہے۔ تم لگاؤ گی نہ؟"

اچانک اپرنا کی بھویں سکڑ گئیں۔ ساری دنیا سے جنگ کر کے اس کا پارہ پارہ دل مغلوب ہو چکا تھا اور وہ دنیا سے بالکل بے تعلقی اختیار کر کے ایک گوشے میں خاموش جا بیٹھا تھا۔ یکایک محبت کی اس پیشکش نے اس پر ایک گہری ضرب لگائی۔ اس نے بھی بیتاب ہو کر جوابی ضرب لگائی۔ کہا "یہ ہال یہ ضائع نہیں ہو گی۔ اسے رکھ دو۔ میرے سوا اور بہت سے لوگ اسے استعمال کرنا جانتے ہیں!" اتنا کہہ کر جواب کے لئے ایک آن کا بھی انتظار کئے بغیر اپرنا پوجا گھر میں چلی گئی اور امرناتھ بے اختیاری کی حالت میں اس رد کی ہوئی سوغات پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھا رہا۔ پہلے اس نے دل ہی دل میں ہزاروں بار اپنے کو نادان کہہ کر اپنے اوپر نفرت بھیجی۔ پھر دیر کے بعد ایک گہری سانس لے کر کہا "اپرنا! تم بڑی سنگدل ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بیٹھا بیٹھا بار بار آنکھیں خشک کرنے لگا۔ اگر اپرنا کھلے لفظوں میں انکار کرتی تو اس کا اثر کچھ اور ہوتا۔ لیکن انکار کئے بغیر ہی انکار کی آگ نے اسے جلا ڈالا ہے اس کے لئے وہ کونسا چارہ کار اختیار کرے۔ کیا وہ اپرنا کو اس کے پوجا کے آسن سے کھینچ کر اسی کے سامنے اس کے رد کئے ہوئے تحفے کو پاؤں کی ٹھوکروں سے توڑ پھوڑ ڈالے اور سب کے سامنے عہد کر لے کہ اب وہ اس کا منہ نہ دیکھے گا۔ وہ کیا کرے؟ کتنا اور کیا کہے؟ کہاں کس لامعلوم جگہ چلا جائے؟ کیا خاک مل کر سادھو سنیاسی ہو جائے اور کبھی اپرنا کے برے دنوں میں یکایک کہیں سے آ کر اس کی امداد کرے؟ اس طرح ممکن اور ناممکن نہ جانے کتنے سوال و جواب اور بحث و مباحثے اس کے ہتک و توہین سے زخم خوردہ دماغ میں بے صبری کے ساتھ پیدا ہونے لگے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ اور ویسے ہی رونے لگا۔ لیکن کسی طرح اس کے ان شروع سے آخر تک غیر مربوط عزائم کی طویل فہرست مکمل نہ ہو سکی۔

x x x x x x

(۸)

اس کے بعد دو دن اور دو راتیں گذر گئیں۔ امرناتھ گھر نہیں سونے آیا۔ ماں کو معلوم ہوا تو انہوں نے بہو کو بلا کر کچھ ڈانٹا ڈپٹا اور بیٹے کو بلا کر سمجھایا بجھایا۔ دَدیا ساس بھی اس درمیان میں کچھ مذاق اڑا گئیں۔ اسطرح بات کچھ ہلکی ہو گئی۔ رات کو اپرنا نے شوہر سے معافی کی بھیک مانگی۔ کہا "اگر تمہارے دل کو تکلیف پہنچی ہو تو مجھے معاف کرو۔"

امرناتھ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ پلنگ کے ایک کنارے بیٹھ کر بچھونے کی چادر کو بار بار کھینچ کر اسے صاف کرنے لگا۔ سامنے ہی اپرنا کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر افسردہ تبسّم تھا۔ اس نے پھر کہا "معاف نہیں کرو گے؟"

امرناتھ نے سر جھکائے ہی کہا۔ معافی کس بات کی؟ اور معاف کرنے کا مجھے حق ہی کونسا ہے؟

اپرنا نے شوہر کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "ایسی بات نہ کہو۔ تم میرے شوہر ہو تم ناراض رہو گے تو میری کیسے گذر ہو گی۔ تم معاف نہ کرو گے تو میں کہاں کھڑی ہونگی؟ کیوں ناراض ہو گئے ہو بتاؤ؟"

امرناتھ نے گلو گیر ہو کر کہا۔ "ناراض تو نہیں ہو!"

"ناراض نہیں ہوئے؟"

"نہیں۔"

اپرنا کو کشید گی اچھی نہیں لگتی۔ اس لئے یقین نہ ہوتے ہوئے بھی اس نے یقین کر لیا اور کہا۔ "تو ٹھیک ہے۔"

اس کے بعد وہ بالکل بے فکر ہو کر بستر کے ایک طرف سو رہی۔ لیکن امرناتھ کو اس پر بہت تعجب ہوا۔ دوسری طرف رخ پھیر کر وہ دل ہی دل میں یہ غور کرنے لگا۔ آخر اس بات پر اس کی بیوی نے یقین کیسے کر لیا۔ میں جو دو دن آیا نہیں ملا نہیں۔ پھر بھی میں غصہ نہیں ہوا۔ کیا یہ یقین کرنے کی بات ہے!"

اتنا بڑا واقعہ اس قدر جلد مٹ کر ختم ہو گیا؟ اس کے بعد جب اس نے سمجھا کہ اپرنا سچ مچ سو گئی ہے تو وہ یکبارگی اٹھ کر بیٹھ گیا اور بغیر کسی ہچک کے زور سے پکار اٹھا۔ "اپرنا! کیا تم سو رہی ہو! اپرنا!"

اپرنا جاگ اٹھی۔ بولی۔ "بیدار ہے ہو؟

"ہاں میں کل کلکتہ چلا جاؤں گا۔

کہاں۔ یہ بات تو پہلے نہیں سنی۔ اتنی جلدی تمہارے کالج کی چھٹی ختم ہو گئی؟ کیا دو چار دن بھی اور نہیں رہ سکتے؟"

"نہیں۔ اب رہنا ناممکن ہے۔"

اپرنا نے کچھ سوچ کر پھر پوچھا۔ "تو کیا تم مجھ سے ناراض ہو کر جا رہے ہو؟"

بات تو اپرنا بھی جانتی ہے لیکن وہ اس بات کو قبول نہ کر سکی شرم نے آ گھیرا اس کی دھوتی کا کنارہ پکڑ کر اسے لوٹا لیا اسے

اندیشہ ہوا کہ کہیں وہ اپنا نکماپن ثابت کر کے اپرنا کے احترام کو صدمہ نہ پہنچا دے۔ اس طرح اس افسردہ دل عورت کی افسردگی اس پر اثر انداز ہوئے بغیر نہ رہی۔ بحیثیت شوہر ہونے کے اس کے دل میں اپنے فطری حقوق کے اعتبار سے جو زعم پیدا ہو سکتا تھا۔ اس کو اپرنا نے چار پانچ مہینے کی قلیل مدت میں رفتہ رفتہ زائل کر دیا۔ اب وہ غصے کا اظہار کرے تو کس بوتے پر۔ اپرنا نے پھر کہا۔ "دیکھو ناراض ہو کر نہ جانا ورنہ میرے دل کو بہت صدمہ پہنچے گا۔"

امرناتھ جھوٹ اور سچ کی آمیزش سے جتنی سخن سازی کر سکتا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اسے اپرنا سے کوئی شکایت نہیں ہے اس کے ثبوت کے طور پر اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ دو روز ٹھیر کر جائے گا چنانچہ وہ دو روز رہ کر چلا بھی گیا۔ لیکن دھوکر فتحیاب ہونے کی ایک شرمناک ٹیس اس کے دل میں قائم ہی رہی۔

× × × × × ×

(۹)

یکبارگی پورے زور کی بارش ہو جانے میں بھی ایک بہتری ہوتی ہے۔ اس طرح آسمان بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ لیکن بوندا باندی سے نہ صرف یہ کہ فضا صاف نہیں ہوتی۔ بلکہ راستہ کیچڑ سے لت پت ہو جاتا ہے اور چاروں طرف کے مناظر کی بدنمائی اور ترقی کر جاتی ہے۔ امرناتھ گھر سے جب کیچڑ میں لت پت ہو کر واپس آیا اسے دھونے کے لئے ایسے عالیشان شہر میں اسے تلاش کرنے کے باوجود تھوڑا سا پانی نہ ملا۔ یہاں اس کے سابق کے نامعلوم مسرت و شادمانی کے جتنے ذرائع تھے۔

ان کے سامنے اپنے کیچڑ سے سنے ہوئے پاؤں نکالنے میں بھی اسے شرم محسوس ہوتی تھی۔ نہ پڑھنے لکھنے میں اس کا دل لگتا تھا۔ نہ کھیل تفریح میں۔ یہاں رہنا بھی اسے ناگوار معلوم ہوتا تھا اور گھر جانے کو بھی دل نہ چاہتا تھا۔ اس کا سینہ ایک ناقابل برداشت درود اذیت کے بوجھ سے دبا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ جسے دور کرنے کے لئے اس کی پسلیاں آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ لیکن اس کے لئے اس کی ساری کوششیں بے کار تھیں،!

اس اندرونی اذیت اور کشمکش نے ایک روز اسے بستر علالت پر ڈال دیا۔ اطلاع پاکر ماں باپ دوڑے ہوئے آئے۔ لیکن اپرنا کو ساتھ نہیں لائے۔ یہ بات نہ تھی کہ امرناتھ کو اس کی قطعی امید رہی ہو۔ پھر بھی اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کا مرض روز بروز ترقی کرتا جا رہا تھا۔ ایسی حالت میں قطرتاً اس کے دل میں اپرنا کے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ لیکن وہ زبان کھول کر اپنی خواہش کا اظہار نہ کر سکا۔ ماں باپ بھی اس بات کو سمجھ نہ سکے وہ محض دوا، غذا، ڈاکٹر، وید، وغیرہ ہی میں الجھے رہے۔ آخر ایک روز امرناتھ نے ان تمام جھگڑوں سے نجات حاصل کر لی۔ یعنی ایک روز وہ اس دنیا سے چل بسا۔

بیوگی کی خبر سے اپرنا پر ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اس کے تمام جسم میں سنسنی سی پیدا ہو گئی۔ اس کے دل میں ایک ہولناک احساس پیدا ہو گیا کہ امرناتھ کی موت اسی کی آرزوؤں کا تو نتیجہ نہیں ہے وہ شائد اتنے دنوں سے دل ہی دل میں یہی چاہ رہی تھی۔ دلوں کی حالت جاننے والے نے اتنے دنوں بعد اس کی یہ آرزو پوری کر دی۔ اس نے

باہر سے سنا اس کے پتا چیخ چیخ کر رو رہے ہیں۔ کیا وہ خواب دیکھ رہی ہے؟ وہ کب آئے۔ اپرنا نے کھڑکی کھولی اور جھانک کر دیکھا۔ واقعی راج نرائن بابو بچوں کی طرح زمین پر پچھاڑیں کھا رہے تھے اور رو رہے تھے بابو کی دیکھا دیکھی وہ بھی گھر میں روئی اور آنسوؤں سے زمین بھگونے لگی

شام ہونے میں زیادہ دیر نہ تھی۔ باپ نے اندر آ کر اپرنا کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا "بیٹی اپرنا!"

اپرنا روتے ہوئے بولی۔ "بابو جی"

"تیرے مدن موہن نے تجھے بلایا ہے بیٹی"

"چلو بابو جی وہیں چلیں"

بیٹی اتنا وہاں تمام کام پڑا ہوا ہے"

چلو بابو جی گھر چلیں۔

"چلو بیٹی چلو" یہ کہتے ہوئے فرط محبت سے باپ نے بیٹی کی پیشانی چوم لی۔ ساتھ ہی تمام رنج و غم کو دل سے دور کر دیا۔ دوسرے روز لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھر لے آئے اور انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولے" وہ ہے بیٹی تیرا مندر اور وہ ہیں تیرے مدن موہن ہیوگی کے لباس اور بے بناؤ سنگار کی حالت میں اپرنا کچھ اور ہی نظر آنے لگی تھی۔ سفید کپڑے اور خشک بالوں نے جیسے اس کو اور بھی حسین ہو دیا تھا۔ باپ کی باتوں نے اس کے دل میں اور یقین پیدا کر دیا تھا معلوم ہوتا تھا۔ دیوتا ہی کے بلاوے پر وہ واپس آ گئی ہے۔ ہونٹوں پر شائد اسی لئے مسکراہٹ ہے۔ مندر کی رونق کی لئے سوگنا اضافہ ہو گیا ہے اسے معلوم ہونے لگا

گویا وہ اس زمین سے بہت بلند ہو گئی۔

جو شوہر اپنی موت سے اس کو اس زمین سے اتنی بلندی پر پہنچا گیا ہے۔ اس مرنے والے کو سو بار پرنام کر کے اپرنا نے اس کیلئے ہمیشگی کے سورگ کی دعا مانگی

x x x x x

(۱۰)

شکتی ناتھ بڑی محویت سے تصویر بنا رہا تھا۔ پوجا کرنے کی نسبت اسے تصویر بنانا زیادہ پسند تھا۔ کیسا چہرہ ہو۔ کیسی ناک ہو۔ کیسے کان ہوں اور آنکھیں کیسی ہونی چاہئیں۔ رنگ کون سا زیادہ نکھرے گا وہ انہیں باتوں کو سوچتا رہتا تھا۔ پوجا میں کون سی چیزیں ہونی چاہئیں اور کون سے منتر پڑھنے چاہئیں۔ یہ سب معمولی باتیں اس کے پیش نظر نہ تھیں۔ دیوتا کے معاملے میں خود کو پرموشن دے کر خادم کے درجے سے باپ کے مرتبے پر پہنچ گیا تھا۔ پھر بھی باپ نے اسے ہدایت دی۔ "شکتی ناتھ آج مجھے بخار زیادہ ہے۔ زمیندار کے گھر جا کر پوجا کر آؤ۔"

شکتی ناتھ نے کہا۔ "ابھی تصویر بنا رہا ہوں"

بوڑھے مجبور باپ نے بگڑ کر کہا "یہ لڑکوں کے کھیل ابھی رہنے دو۔ بیٹا پہلے جا کر کام کر آؤ۔"

پوجا کا منتر پڑھنے کو اس کا بالکل جی نہ چاہتا تھا۔ پھر بھی جانا ہی پڑا۔ باپ کے حکم کے مطابق نہا دھو کر اور چادر ا

پر ڈال کر وہ دیو مندر میں جا کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار اس مندر میں پوجا کرنے گیا تھا۔ لیکن ایسی عجیب بات اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اتنے زیادہ پھول، دھوپ اگر وغیرہ خوشبو کا انتظام بھوج اور کھانے کا اتنا اہتمام! وہ بہت پریشان ہوا۔ اتنی چیزیں لے کر وہ کیا کرے گا۔ کس طرح کس کس کی پوجا کرے گا؟ سب سے زیادہ حیرت اسے اپرنا کو دیکھ کر ہوئی۔ یہ کون ہے؟

یکایک، کہاں سے آ گئی؟ اتنے دنوں کہاں تھی؟

اپرنا نے پوچھا۔ "تم بھٹاچاریہ جی کے بیٹے ہو؟"

شکتی ناتھ نے کہا "ہاں"

"تو پاؤں دھو کر پوجا شروع کرو۔"

شکتی ناتھ پوجا کرنے بیٹھا تو سب کچھ بھول گیا۔ اسے ایک منتر یاد نہیں آ رہا تھا۔ اس کا دماغ حاضر تھا نہ پوجا میں اس کا دل لگتا تھا وہ بار بار یہی سوچ رہا تھا کہ یہ کون ہے! یہ اتنی خوبصورت کیوں معلوم ہو رہی ہے اور یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ پوجا کی ترتیب میں بھی فرق پڑنے لگا۔ ہوشیار ممتحن کی طرح پیچھے بیٹھی ہوئی اپرنا سب کچھ دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ کبھی گھنٹہ بجا کر کبھی پھول ڈال کر کبھی بھوج کی تھالی پر پانی چھڑک کر یہ نادان پجاری صرف پوجا کا ڈھونگ کر رہا ہے۔ ہمیشہ دیکھتے دیکھتے اپرنا اچھی طرح جان گئی تھی۔ کہ پوجا کسطرح ہوتی ہے؟ شکتی ناتھ اسے دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔

پوجا ختم ہونے پر اپرنا نے سخت لہجے میں کہا "تم برہمن کے بیٹے ہو۔ اور تمہیں پوجا کرنا نہیں آتا؟"

شکتی ناتھ نے کہا۔ "کیوں نہیں آتا؟"

"خاک آتا ہے۔"

شکتی ناتھ نے ایک بار اپرنا کی طرف دیکھا اور چلنے لگا۔ اپرنا نے روک کر کہا۔ "مہاراج! یہ سب سامان تو باندھ کر لیتے جاؤ لیکن کل نہ آنا۔ تمہارے بیتا اچھے ہو جائیں گے تو وہی آئیں گے۔"

اپرنا نے خود ہی اس کی چادر اور انگوچھے میں تمام سامان باندھ کر اسے رخصت کر دیا۔

مندر کے باہر آ کر شکتی ناتھ بار بار کانپ اٹھتا تھا۔ دوسری طرف اپرنا نے پھر سے پوجا کا سامان مہیا کیا اور دوسرے برہمن کو بلا کر پوجا کی تکمیل کرائی۔

(۱۱)

ایک مہینہ گذر گیا اچاریہ جدو ناتھ زمیندار راج نرائن بابو کو سمجھا کر کہہ رہے تھے "آپ تو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ بڑے مندر کی یہ وسیع پوجا مدھو بھٹا چاریہ کے لڑکے سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔"

راج نرائن بابو نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "بہت دن ہوئے اپرنا بھی بالکل یہی بات کہہ رہی تھی۔"

اچاریہ نے اور سنجیدہ صورت بنا کر کہا۔ ضرور کہا ہوگا۔ وہ برملا لکشمی کا روپ ہیں۔ ان سے کوئی چیز چھپی تھوڑی ہی ہے۔"

زمیندار بابو کا بھی بالکل یہی خیال ہے۔ اچاریہ کہنے لگے۔ پوجا میں کروں یا کوئی اور کرے۔ اچھا آدمی ہونا چاہیئے۔ مدھو بھٹا چاریہ

جب تک زندہ تھے۔ انہیں نے پوجا کی۔ اب ان کے بیٹے ہی کو پروہت کا کام کرنا منا سب ہے۔ لیکن وہ تو صرف کاغذ رنگنا جانتا ہے۔ کھیل تماشے کی چیز بنا سکتا ہے۔ وہ پوجا پاٹ کرنا کیا جانے!

راج نرائن بابو نے اجازت دے دی۔ پوجا آپ کریں۔ لیکن آپ کے بارے میں ایک مرتبہ اپرنا سے بھی پوچھ لوں۔"

باپ سے یہ سن کر اپرنا نے نفی میں سر ہلا دیا بولی۔ "کہیں ایسا بھی ہوا ہے۔ برہمن کا لاوارث لڑکا ٹھیرا۔ اسے کہاں چھوڑ دیا جائے! اسے یہاں تک معلوم ہے وہ پوجا کرے گا۔ بھگوان اسی سے خوش ہوں گے۔"

بیٹی کی بات سن کر باپ کو ہوش آیا۔ بولے۔ میں نے اس معاملے پر اس قدر غور فکر نہیں کیا تھا بیٹی۔ تمہارا مندر ہے تمہاری ہی پوجا ہے۔ تمہاری جو خوشی ہو۔ وہ کرو۔ جسے چاہو۔ اس کام پر مقرر کرو۔"

اتنا کہہ کر باپ چلے آئے۔ اپرنا نے شکتی ناتھ کو بلا کر پوجا کا کام اسی کے سپرد کیا۔ پھٹکار سننے کے بعد سے وہ ادھر نہیں آیا تھا۔ اسی درمیان میں اس کے باپ کا انتقال بھی ہو گیا آج کل وہ خود بھی بیمار تھا اس کے افسردہ چہرے پر اندوہ غم کے آثار دیکھ کر اپرنا کو اس پر بہت ترس آیا۔ بولی "تم جو کچھ جانتے ہو۔ اسی کے مطابق پوجا کرو۔ بھگوان اسی سے سیر ہو جائیں گے۔"

اس محبت آمیز سلوک نے اس کا حوصلہ بڑھا دیا۔ وہ دل لگا کر ہوشیاری سے پوجا کرنے بیٹھا۔ پوجا ختم ہونے کے بعد وہ جتنا کھا سکتا تھا۔ اتنا اپرنا نے اپنے ہاتھ سے باندھ کر کہا۔ "بہت اچھی پوجا کی

ہے۔ مہاراج۔ کیا تم اپنے ہاتھ سے پکا کر کھاتے ہو؟"
"کسی روز پکا لیتا ہوں۔ کسی روز۔ جس روز بخار آجاتا ہے۔ اس روز نہیں پکا سکتا۔"
"کیا تمہارے اور کوئی نہیں ہے؟"
"نہیں۔"
شکتی ناتھ کے چلے جانے پر اپرنا نے اس کے متعلق کہا۔ "آہ بیچارہ"۔ اس کے بعد دیوتا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اس کی طرف سے پرارتھنا کی۔ "بھگوان اس کی پوجا سے تم مسرور مطمئن ہونا۔ ابھی لڑکا ہی ہے۔ اس کی سہو و خطا پر مواخذہ نہ کرنا۔"

اس روز سے اپرنا نوکرانی کے ذریعہ اس کی خبر گیری کرتی رہتی کہ وہ کیا کھاتا ہے، کیا کرتا ہے۔ اسے کس چیز کی ضرورت ہے۔ اس لاوارث نوعمر برہمن کو اس نے لامعلوم طور پر اپنی نگرانی میں لے کر اس کا سارا بار برضا و رغبت اپنے ذمے لے لیا۔ اسی روز سے ان دونوں نوعمر لڑکے اور نوعمر لڑکی نے اپنی بھگتی محبت اور بھول چوک سب کو ایک کر کے اس مندر کی پناہ پکڑ کر زندگی کے دوسرے کاموں سے علیحدگی اور بے تعلقی اختیار کر لی۔ شکتی ناتھ پوجا کرتا اپرنا بتا دیا کرتی۔ شکتی ناتھ دعا پڑھتا۔ اپرنا دل ہی دل میں دیوتا کو اس کا مطلب سمجھا دیا کرتی۔ شکتی ناتھ ہاتھ سے خوشبو پھول اٹھاتا۔ اپرنا انگلی سے دکھا دکھا کر بتاتی جاتی "مہاراج اس طرح سنگھاسن سجاؤ تو بہت اچھا لگے گا۔ اسی طرح اس وسیع مندر کے وسیع کام انجام پانے لگا۔ اچاریہ نے یہ سب باتیں دیکھیں اور سنیں۔ کہا۔ لڑکوں

کا کھیل ہو رہا ہے۔"

بوڑھے راج نرائن نے کہا۔ جو کچھ بھی ہو یہ اچھا ہی ہے کہ لڑکی اپنی حالت کو بھولی رہے۔"

x x x x

—— (۱۲) ——

جس طرح تھیٹر کے اسٹیج پر جنگل پہاڑ طوفان سینہ چشم زدن میں غائب ہو جاتا ہے اور ان چیزوں کی جگہ یکایک ایک عالیشان راج محل کہیں سے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور لوگوں کے دلوں سے تکلیف و مصیبت کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور لوگ اپنے اندر ایک آسائش و خوشحالی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ شکتی ناتھ کی زندگی میں بھی ایسا ہی ایک انقلاب ہو گیا۔ اول تو اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ وہ جاگ رہا تھا اور اب نیند کی حالت میں خوش آئند اور راحت آگیں خواب دیکھ رہا ہے یا پہلے نیند کی حالت میں خواب دیکھ رہا تھا اور اب یکایک بیدار ہو گیا ہے

لیکن اس کے پہلے کے وہ شکستہ و پراگندہ کھلونے رہ رہ کر اسے اس بات کی یاد دلایا کرتے کہ اس غیر ذمہ دارانہ دیو سیوا کی سنہری زنجیر نے اس کے تمام جسم کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور جو رہ رہ کر جھنکار کر اٹھتی ہے۔ وہ اپنے مرے ہوئے باپ کو یاد کرتا اور اپنی آزادی کی نسبت سوچتا تو اسے معلوم ہوتا گویا وہ اپرنا کے ہاتھ بک چکا ہے اس طرح اپرنا کی محبت نے رفتہ رفتہ ایک جادو کی طرح اسے اپنے قابو

میں کرلیا۔ اچانک ایک روز شکتی ناتھ کا ممیرا بھائی آیا۔ اس کی بھین کی شادی تھی۔ اس کے ماما کلکتے میں رہتے تھے ابھی ان کے دن اچھے تھے اس لئے خوشی کے موقعہ پر بھانجے کی یاد آئی۔ شکتی ناتھ کو اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ وہ کلکتہ جائے گا۔ وہ تمام رات بھائی کے پاس بیٹھا کلکتے کی راحت وآسائش شان وشوکت اور ثروت خوشحالی کی کہانی سنتا رہا جس نے اسے کلکتہ کا والہ وشیدا بنا دیا۔ دوسرے روز مندر جانے کو اس کا دل نہ چاہا اپرنا نے دیکھا کہ صبح ہوگئی اور شکتی ناتھ کا پتہ نہیں تو اس نے اسے بلوا بھیجا۔ شکتی ناتھ نے جا کر کہا۔ کلکتہ جا رہا ہوں۔ ماما نے بلایا ہے۔"

یہ کہہ کر شکتی ناتھ سکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اپرنا کچھ دیر چپ رہی پھر بولی "کب تک واپس آؤ گے؟"

شکتی ناتھ نے ڈرتے ہوئے کہا "ماما کی اجازت ملتے ہی چلا آؤں گا

اپرنا نے پھر کچھ نہیں پوچھا پھر وہی جدو ناتھ اچاریہ آکر پوجا کرانے لگے۔ اپرنا پھر اسی طرح پوجا دیکھنے لگی۔ لیکن اسے بولنے کی کوئی بات نہیں معلوم ہوئی نہ کچھ بولنے کو اس کا جی ہی چاہا۔

کلکتہ میں ہر طرح کی دلچسپیاں اور آسائشوں میں کاشی ناتھ کی زندگی گذر رہی تھی۔ پھر بھی کچھ دنوں بعد اس کا دل گھر واپس آنے کے لئے مضطرب ہونے لگا۔ اب طویل اور افسردہ دن اس کے کاٹے نہ کٹتے وہ رات کو خواب دیکھنے لگا۔ اپرنا اسے بلا رہی ہے اور جواب نہ پاکر خفا ہو رہی ہے۔ آخر ایک روز اپنے ماما سے کہا "میں گھر جاؤں گا۔ ماما نے روکا "وہاں جنگل میں جا کر کیا کرو گے یہاں رہو پڑھو لکھو میں

تمہیں نوکری دلادوں گا۔"

شکتی ناتھ سر ہلا کر خاموش ہو گیا۔ ماما نے کہا۔" تو جاؤ۔"

بڑی بہو نے کاشی ناتھ کو بلا کر کہا۔" تو لالہ جی! کل گھر چلے جاؤ گے؟"

شکتی ناتھ بولا۔ "ہاں؟"

"اپرنا کے لئے دل گھبرا رہا ہے نہ؟"

شکتی ناتھ نے کہا۔ "ہاں۔"

"تو وہ تمہارا بہت خیال رکھتی ہے نہ!"

شکتی ناتھ نے سر جھکائے ہوئے کہا۔" بہت خاطر کرتی ہے۔"

بڑی بہو دل ہی دل میں مسکرائیں۔ انہوں نے اپرنا کے بارے میں پہلے ہی سنا تھا خود شکتی ناتھ نے بھی سب باتیں بتائی تھیں۔ وہ بولیں" تو لالہ جی۔ یہ دو چیزیں لیتے جاؤ۔ اسے دے دینا۔ وہ اور بھی پیار کرے گی۔" اتنا کہہ کر اس نے شیشی کا کاگ کھولا اور تھوڑا سا دل خوش "سینٹ" اس کے بدن پر چھڑک دیا۔ اس کی خوشبو سے شکتی ناتھ کا دل فرحت و سرور سے لبریز ہو گیا۔ وہ دونوں شیشیوں کو چادر کے کونے میں باندھ کر دوسرے ہی روز گھر کے لئے روانہ ہو گیا۔

(۱۴)

شکتی ناتھ مندر میں داخل ہوا۔ پُوجا ختم ہو چکی تھی۔ چادر میں سینٹ کی شیشیاں بندھی تھیں لیکن ان چند ہی دنوں میں اپرنا اس سے اس قدر دُور ہو چکی تھی کہ اسے ہمت نہ ہوئی کہ اپرنا کو وہ شیشیاں دے۔ وہ زبان کھول کر کسی طرح یہ نہ کہہ سکا کہ میں تمہارے لئے بڑے شوق سے کلکتے سے اس کو لایا ہوں۔ سوگندھ سے تمہارے دیوتا خوش ہوتے ہیں

تمہارا دل بھی خوش ہوگا۔"

اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا۔ وہ روزانہ چادر میں شیشیاں باندھ کر لے جاتا اور واپس لاتا اور ان کو بڑی احتیاط سے دوسرے روز کیلئے اٹھا کر رکھ دیتا۔ پہلے کی طرح ایک روز بھی اگر اپرنا اسے بلاتی اور اس سے کچھ بات چیت کرتی تو شاید وہ اپنا تحفہ اسے دے ڈالتا لیکن ایسا موقع ہی اسے نہ ملا۔

شکتی ناتھ کو دو روز سے بخار آرہا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ڈرتے ڈرتے پوجا کرانے جاتا۔ کسی لامعلوم خوف کی وجہ سے وہ اپنی بیماری کا حال بھی نہ کہہ سکا۔ لیکن اپرنا نے پتہ لگا لیا کہ شکتی ناتھ نے دو روز سے کچھ کھایا نہیں ہے۔ پھر بھی پوجا کرانے آیا ہے۔

اس نے پوچھا۔ "پجاری! تم نے دو روز سے کچھ کھایا نہیں؟"

شکتی ناتھ نے سوکھے ہوئے منہ سے کہا۔ "روزانہ رات کو بخار آجاتا ہے۔"

"بخار آتا ہے تو نہاتے کیوں ہو اور پوجا کرنے کیوں آتے ہو؟ تم نے کہہ کیوں نہیں دیا؟"

شکتی ناتھ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ ایک لمحہ میں ساری باتیں بھول گیا اور چادر سے دونوں شیشیاں کھول کر بولا۔ "یہ تمہارے لئے لایا ہوں۔"

"میرے لئے؟"

"ہاں تمہیں خوشبو پسند ہے نہ؟"

جس طرح گرم دودھ آگ کی ذراسی گرمی پاتے ہی بلبلے دینے اور

کھولنے لگتا ہے۔ اسی طرح اپرنا کے جسم کا سارا خون کھول اٹھا۔ وہ شیشیوں کے دیکھتے ہی پہچان گئی۔ اس نے بھاری آواز میں کہا۔ "دو" دونوں شیشیوں کو لے کر مندر کے باہر جہاں پوجا کے پڑے ہوئے پھول سوکھ رہے تھے پھینک دیا۔ مارے خوف کے شکتی ناتھ کے دل کا خون جم گیا۔ اپرنا نے سخت لہجے میں کہا۔ "مہاراج! تمہارے اندر کچھ بھرا ہوا ہے۔ اب تم میرے سامنے نہ آنا۔ مندر کے ہمائے کے بھی قریب نہ پھٹکنا۔" اس کے بعد اپرنا نے اپنی انگلی سے باہر کا راستہ بتا کر کہا۔ "جاؤ۔"

x x x x x

شکتی ناتھ کو گئے تیسرا دن تھا۔ جدو ناتھ اچاریہ پھر پوجا کرانے لگے اور اپرنا افسردہ چہرہ لئے پھر پوجا دیکھنے لگی۔ جیسے کسی اور کی پوجا ہے اور اسے انجام دے رہا ہے کوئی اور؟"

پوجا ختم کر کے پوجا کے سامان کو انگوچھے میں باندھتے ہوئے اچاریہ جی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "دوا علاج نہ ہونے کی وجہ سے لڑکا مر گیا۔"

اچاریہ کے چہرے کی طرف دیکھ کر اپرنا نے پوچھا۔ کون مر گیا؟

"تم نے نہیں سنا کیا؟ کئی روز تک بخار میں پڑے رہنے کے بعد بدھو کا اچاریہ کا لڑکا آج صبح مر گیا۔"

اپرنا اسی طرح ان کا منہ تکتی رہی۔ اچاریہ نے دروازے کے باہر آ کر کہا۔ "آج کل پاپ کے پھل سے موت ہو رہی ہے۔ دیوتا کے ساتھ دل لگی چل سکتی ہے بیٹی"

اچاریہ چلے گئے اپرنا دروازہ بند کر کے زمین پر سر ٹیک کر

رونے لگی اور زار زار رو کر پوچھنے لگی: "بھگوان! یہ کس کے پاپ کی وجہ سے ہے؟"

وہ بہت دیر کے بعد اٹھی اور آنسو خشک کر کے سوکھے پھولوں کے اندر سے محبت کی اس سوغات کو نکال لائی اور اسے سر سے لگا کر مندر میں جا کر اسے دیوتا کے قدموں میں رکھتے ہوئے بولی۔ بھگوان! جیسے میں قبول نہ کر سکی۔ اسے تم قبول کرو۔ میں نے اپنے ہاتھ سے کبھی پوجا نہیں کی۔ آج کر رہی ہوں۔ تم اسے قبول کرو۔ اس کے سوا میری اور کوئی آرزو نہیں ہے۔"

مقدمے کا نتیجہ

بوڑھے برن ابن کی وفات کے بعد اس کے دونوں بیٹے شیبو اور شمبھو روزمرہ لڑتے جھگڑتے، پانچ چھ ماہ ایک ہی چولھے اور ایک ہی مکان میں رہے اور اس کے بعد دونوں الگ الگ ہو گئے۔

گاؤں کے زمیندار چودھری صاحب نے خود آ کر دونوں کی مشترکہ کھیتی باڑی، زمین جائیداد، باغ تالاب سب کو تقسیم کر دیا۔ چھوٹے بھائی شمبھو نے پرانے مکان کو چھوڑ دیا اور سامنے تالاب کے اس طرف مٹی کا گھر بنا کر بیوی بچوں کے ساتھ اس میں رہنے لگا۔

تمام چیزوں کے حصے بخرے ہو گئے صرف ایک چھوٹے سے بانسوں کا جھنڈ تقسیم نہ ہو سکا۔ کیونکہ شمبھو نے عذر کرتے ہوئے کہا "چودھری

جی! بانسوں کی مجھے بڑی ضرورت ہے۔ گھر بار سب پرانا ہو گیا۔ چھپّر نئے سرے سے بندھوانا ہے۔ کھونٹی اُونٹی کے لئے بھی مجھے بانس چاہئیں گاؤں میں کس سے مانگنے جاؤں گا۔ بتائیے"

شمبھو نے اس کی تردید کرنے کی غرض سے اُٹھ کر بڑے بھائی کے منہ کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "آہاہا۔ ان کو کھونٹا اونٹا کے لئے بانسوں کی ضرورت ہے اور میرے گھر کا کام تو کیلے کے درخت ہی سے ہو جائے گا۔ کیوں؟ یہ نہیں ہو سکتا، چودھری صاحب! اس بانسوں کے جھنڈ کے بغیر تو میرا کام چل نہیں سکتا۔ ہاں میں کہے دیتا ہوں"

فیصلہ یہیں تک ہوتے ہوتے رہ گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمبھو اگر اس کی ٹہنی پر بھی ہاتھ لگاتا تو شیبو گنڈاسہ لے کر اٹھ بیٹھتا اور شبو کی بیوی کبھی بانس جھاڑ کے پاس پاؤں رکھتی تو شمبھو لاٹھی لے کر اسے مارنے کو دوڑ پڑتا۔

اس روز علی الصبح اسی بانس جھاڑ کے سبب دونوں خاندانوں میں بڑا بھاری فساد ہو گیا۔ دیوی کی پوجا یا کسی دیوتا کے لئے شبو کی بیوی گنگامنی کو تھوڑے سے بانس کے پتے درکار تھے۔ دیہات میں یہ چیز کوئی نایاب شے نہ تھی۔ مگر اپنے ہاں موجود ہوتے ہوئے دوسرے کے آگے ہاتھ پھیلانے میں اسے شرم محسوس ہوئی۔ خاص کر اسے اس بات کا یقین تھا کہ دیور اس وقت ضرور کھیلان کو چلا گیا ہو گا چھوٹی بہو اکیلی بھلا کر ہی کیا سکتی ہے؟

مگر معلوم نہیں کس وجہ سے شمبھو کو اس روز کھلیاں جانے میں دیر ہو گئی۔ وہ ہاتھ منہ دھو کر باسی چاول کھانے کی تیاری

کر رہی رہا تھا کہ اتنے میں اس کی بیوی تالاب کے گھاٹ سے گرتی پڑتی آئی اور شوہر سے سارا حال بیان کر دیا۔

شمبھو نے ہاتھ کا لوٹا وہیں رکھ دیا ہاتھ منہ دھونا جہاں کا تہاں رہ گیا۔ اور وہ چلا کر سارے محلے کو جگاتا ہوا تین چھلانگوں میں جائے وقوع پر جا پہنچا اور جھوٹے ہاتھوں سے ہی بھاوج کے ہاتھ سے بانس کے پتے چھین کر پھینک دئے۔ ساتھ ہی اس کو مخاطب کر کے چند ایسے جملے کہہ دئے جو بھمن کے کیریکٹر سے ہرگز نہیں سیکھے گئے تھے۔ یہ بات بلا کسی قسم کے شک و شبہ کے کہی جا سکتی ہے۔

ادھر بڑی بہو روتی روتی گھر پہنچی اور اسی وقت کھلیان میں شوہر کے پاس خبر بھیج دی۔ شیبو بیل چھوڑ کر درانتی ہاتھ میں لئے دوڑا آیا اور بیوی کے پاس کھڑے ہو کر بھائی کی عدم موجودگی میں ہتھیار گھماتے ہوئے اس قدر شور مچانا شروع کیا کہ چاروں طرف لوگ جمع ہو گئے۔ اس سے بھی جب ارمان پورا نہ ہوا تو وہ سیدھا زمیندار کے ہاں نالش کرنے پہنچا اور یہ کہہ کر ڈرانے لگا کہ اگر چودھری صاحب انصاف کریں۔ تو بہتر۔ ورنہ میں صدر عدالت میں جا کر ایک نمبر کا مقدمہ کر دوں گا۔

ادھر شبھو پتے چھیننے کا کام پورا کر کے جھٹ پٹ بیل لے کر ہل جوتنے چلا گیا۔ بیوی کے منع کرنے پر بھی وہ نہ رکا۔ گھر میں بہو اکیلی تھی۔ اتنے میں جیٹھ جی نے آ کر گرج گرج محلہ اکٹھا کر لیا اور جوش کے ساتھ ایک طرفہ فتح حاصل کر چلے گئے۔ چونکہ چھوٹی بہو تھی۔ اس لئے وہ سب کچھ کانوں سے سن کر بھی کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس سے اس کے تاسف اور شوہر کے خلاف کی ناراضی کی کچھ انتہا نہ رہی۔ اس نے رسوئی کی طرف

پاؤں بھی نہ رکھا اور منہ بنا کر برآمدے میں پیر پھیلا کر بیٹھ گئی۔ شبو کے ہاں بھی یہی حال ہوا۔ بڑی بہو یہ عہد کئے بیٹھی تھی کہ یا تو اس کا کچھ فیصلہ ہونا چاہیئے ورنہ وہ اس گھر میں پانی تک نہ پیئے گی اور سیدھے اپنے میکے کو چلی جائے گی۔ بانس کے دو پتوں کے لئے دیور کے ہاتھوں اس قدر بیعزتی؟"

ڈیڑھ پہر دن چڑھ گیا۔ اب تک شبو کا کوئی پتہ نہیں۔ بڑی بہو تڑپ رہی تھی۔ "کہیں چودھری صاحب کے مکان سے سیدھے کچہری تو نہیں چلے گئے لگان جمع کرنے۔"

اسی وقت زور کی آہٹ کے ساتھ باہر کا دروازہ کھلا اور شمبھو کا بڑا بیٹا گیا رام اندر داخل ہوا۔ اس کی عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ ہوگی مگر اس سن و سال میں بھی اس کا غیظ و غضب اور اس کی زبان دونوں چیزیں اس کے باپ کے غصہ اور زبان کو بھی مات کر گئی تھیں وہ گاؤں کے پرائمری اسکول میں تعلیم پاتا تھا۔ ان دنوں اسکول صبح کھلتا تھا۔ اس لئے ساڑھے دس بجے ہی چھٹی ہو گئی تھی۔

گیا رام جب سال بھر کا تھا۔ اس وقت اس کی ماں مر گئی تھی۔ اس کا باپ شمبھو دوبارہ شادی کر کے نئی بیوی تو گھر لے آیا۔ مگر اس بے ماں کے بچے کی پرورش کا تمام بوجھ تائی ہی پر آپڑا اور جب تک دونو بھائی الگ نہیں ہوئے۔ اس کی پرورش اور خبر گیری وہی کرتی رہی۔ سوتیلی ماں کے ساتھ اس کا کبھی کوئی خاص تعلق نہیں رہا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے الگ ہو کر نئے مکان میں چلے جانے پر بھی جہاں اس کا داؤ لگتا وہ وہیں کھا پی لیا کرتا۔

آج وہ اسکول سے گھر گیا تو سوتیلی ماں کا چہرہ اور کھانے کا انتظام دیکھ کر بگیہ کی آگ کی مانند مشتعل ہو اٹھا اور اس گھر میں آیا۔ یہاں تائی کا منہ دیکھ کر اس کی آگ میں پانی کی بجائے مٹی کا تیل پڑ گیا۔ اس نے بلا کسی تمہید کے کہا۔ "بھات دے تائی!"

تائی خاموش جس طرح بیٹھی تھی۔ ویسے ہی بیٹھی رہی۔ غصہ سے گیارام نے زمین پر پیر پٹکتے ہوئے کہا۔ بھات دیگی یا نہیں دے گی؟ یہ بتا" گنگا منی نے سر اٹھا کر مارے غصّہ کے گرج کر کہا۔ "تیرے لئے بھات پکائے بیٹھی ہوں نا! تیری سوتیلی ماں بدنصیب بھات نہ دے سکی جو یہاں آیا ہے ہنگامہ بپا کرنے؟"

گیارام نے چلاّ کر کہا۔ اس کمبخت کی بات میں نہیں جانتا تو دیگی یا نہیں بتا؟ نہیں دے گی تو جاتا ہوں تیری سب ہنڈیاں مٹکیاں توڑنے"۔ یہ کہتا ہوا وہ برآمدے کے پاس جاکر ایندھن کے ڈھیر میں سے ایک لکڑی اٹھا کر تیزی سے رسوئی گھر کی طرف چل دیا۔

تائی مارے ڈر کے زور سے چلاّ اٹھی۔ گیا حرامزادے ڈکیت! زیادہ اودھم کیا تو سمجھ لینا۔ ہاں۔ دو دن بھی نہیں ہوئے۔ میں نے نئی ہنڈیا مٹکیاں نکالی ہیں۔ ایک بھی ٹوٹ پھوٹ گئی۔ تو تیرے تاؤ سے کہہ کر تیری ٹانگ نہ تڑوا دی تو کہنا۔ ہاں!"

گیارام نے رسوئی گھر کی زنجیر پر ہاتھ رکھا ہی تھا۔ کہ یکایک اسے ایک نئی بات یاد آگئی اور اس نے مقابلتاً پرسکون انداز میں کہا "اچھا بھات نہیں دیتی تو نہ دے جا مجھے نہیں چاہیئے۔ ندی کے کنارے بڑ کے نیچے برہمنوں کی لڑکیاں ٹوکریاں بھر بھر کے چیوڑا اور مرمڑکی

لے جا کر پوجا کر رہی ہیں جو مانگتا ہے اس کو دے رہی ہیں۔ وہیں
جاتا ہوں۔ انہیں کے پاس۔"

گنگا منی کو اسی وقت یاد آ گیا کہ آج "ارنیہ ششٹھی" ہے۔ پل بھر
میں ہی اس کا برہم مزاج نرم ہو گیا۔ اس کے باوجود چہرے کا رنگ
جوں کا توں قائم رکھ کر اس نے کہا "چلا نہ جا۔ کیسے جاتا ہے دیکھوں گی۔"

"تو دیکھ لینا۔ یہ کہہ کر گیا نے ایک پھٹا ہوا انگوچھا اٹھا کر کمر
سے لپیٹ لیا اور جیسے ہی وہ جانے کے لئے تیار ہوا۔ گنگا منی نے
غصّہ سے کہا "آج اگر چھٹ کے دن دوسروں کے ہاں سے مانگ کر کھایا
تو تیری کیا درگت بناتی ہوں۔ دیکھنا نصیب زد ہے!"

گیا نے جواب نہیں دیا۔ وہ رسوئی گھر میں جا گھسا اور ہتھیلی پر
تیل لے کر سر پر رگڑتا ہوا جا ہی رہا تھا کہ اتنے میں اس کی تائی نے
آنگن میں آ کر ڈرتے ہوئے کہا۔ ڈاکو کہیں کا۔ دیوی دیوتاؤں کے
ساتھ گنوارپن! وہاں سے ڈبکی لگا کر لوٹ نہ آیا تو اچھا نہیں ہوگا۔
کہے دیتی ہوں۔ آج میں ویسے ہی غصے میں ہوں۔"

مگر گیا رام ڈرنے والا لڑکا نہ تھا۔ وہ صرف دانت نکال کر
تائی کو ٹھینگا دکھا کر بھاگ گیا۔

گنگا منی اس کے پیچھے پیچھے سڑک تک دوڑی آئی اور لگی چلانے
آج چھٹ کے دن لڑکے بھات کھاتے ہیں جو تو کھانا چاہتا ہے!
ٹپال گڑ ر ا کے سندیش سے کیلے سے دودھ
دہی سے پھل آہار نہیں کر سکتا جو تو جا رہا ہے۔ پرائے گھر مانگ کر
کھانے مانجھی کے گھر تو ایسا نواب پیدا ہوا ہے!"

گیا کچھ دور جا کر کھڑا ہو گیا۔ بولا:- تب تو نے دیا کیوں نہیں منہ جلی! کیوں کہا کہ کچھ نہیں ہے؟"

گنگا گال پر ہاتھ رکھ کر دنگ رہ گئی اور بولی۔ سنو تو لڑکے کی باتیں؟ میں نے کب کہا تجھ سے کہ کچھ نہیں ہے؟ نہانے تک کا ٹھکانا نہیں۔ کچھ بات نہ چیت۔ ڈکیت کی طرح گھر میں گھس آیا اور لگا کہنے دے بھات! بھات کیا آج کھایا جاتا ہے جو دیتی۔ میں کہتی ہوں۔ سب کچھ موجود ہے تو نہا تو آ۔"

گیا نے کہا:- تیرا پھل ہار سڑ جائے۔ روز روز ابھاگنیں لڑائی جھگڑا کریں گی اور رسوئی کی زنجیر چڑھا کر پاؤں پھیلا کر بیٹھ رہیں گی اور روز میں دوپہر کے بعد سوکھا ہوا بھات کھاؤں گا۔ جاؤ میں تم لوگوں میں سے کسی کے ہاں بھی نہیں کھانا چاہتا۔ جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ پھر جانے لگا۔ یہ دیکھ کر گنگامنی وہیں کھڑی کھڑی غمگین لہجے میں کہنے لگی:- آج چھٹ کے دن کسی کے یہاں سے مانگ کر براشگن نہ کر گیا! راجہ بیٹا کیسا ہے میرا؟ اچھا تو چار پیسے دوں گی سن تو۔"

گیارام نے منہ بھی نہ پھیرا اور وہ تیزی سے چلا گیا۔ چلتے چلتے اس نے کہا:- نہیں چاہیئے۔ مجھے پھل آہار۔ نہیں چاہئیں پیسے۔ تیرے پھل آہار سڑ میں"۔ ۔ ۔ ۔ وغیرہ وغیرہ۔"

جب وہ نظر سے غائب ہو گیا تو گنگامنی گھر لوٹ آئی اور برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت مارے غصہ کے اس کی ایسی حالت ہو رہی تھی جیسے تن میں جان ہی نہ رہی ہو۔ وہ گیا کے اس برے

برتاؤ سے دکھی ہو کر اس کی سوتیلی ماں کو کوسنے اور گالیاں دینے لگی۔
ادھر ندی کی طرف چلتے چلتے راستے میں تائی کی باتیں گیا کے کان میں گونجنے لگیں۔ ایک تو فطرتاً اچھے کھانوں کا شائق تھا۔ دوسرے پٹالی گڑ کے سندیش۔ دودھ دہی کیلے۔ اس پر چار پیسے نذرانہ۔ اس کا دل بہت ہی جلد نرم ہونے لگا۔
گیا رام نہا دھو کر شدید بھوک کی حالت میں گھر واپس آیا اور آنگن میں پہنچ کر چلایا۔ پھل آہار کا سامان جلدی لے آتا ئی! بڑی زور کی بھوک لگی ہے مجھے! لیکن پٹالی سندیش کم دے گی تو آج تجھی کو کھا جاؤں گا۔"
گنگا منی گائے کی خدمت کے لئے گئوشالہ میں داخل ہوئی ہی تھی۔ کہ گیا کا شور سن کر وہ دل میں اپنی غلطی کو سمجھ گئی۔ گھر میں دودھ دہی چیوڑا اور گڑ تو تھا مگر کیلے نہیں تھے اور نہ پٹالی گڑ کے سندیش اس وقت تو اس نے گیا کو روکنے کے لئے جیسی دل میں آئی۔ ترغیب دے دی تھی مگر اب؟
اس نے وہیں سے آواز دی۔ "تو کپڑے بدل۔ میں تالاب سے ہاتھ دھو کر آتی ہوں۔"
"جلدی آ۔" حکم دے کر گیا نے کپڑے بدلے اور وہ خود اپنے ہاتھ سے آسن بچھا کر لوٹے میں پانی رکھ کر تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ گنگا منی جلدی جلدی ہاتھ دھو کر لوٹ آئی اور خوش ہو کر بولی۔ دیکھ تو کیسا راجہ بیٹا ہو گیا، بات بات پر غصہ کرتے ہیں کہیں۔"
یہ کہتی ہوئی وہ بھنڈار گھر سے کھانے کا سامان نکال لائی۔"

گیارام نے پل بھر میں سب سامان دیکھ لیا اور سخت لہجے میں پوچھا۔ "کیلے کہاں ہیں؟"

گنگامنی نے ادھر ادھر کرکے جواب دیا۔ ڈھاکنا بھول گئی تھی بیٹا سب چوہے کھا گئے۔ اب ایک بلّی پالے بغیر گذارہ نہیں ہوگا۔

گیا نے ہنس کر کہا۔ "چوہے کہیں کیلے کھاتے ہیں؟ تیرے ہاں تھے ہی نہیں یہ کیوں نہیں کہتی؟"

گنگامنی نے تعجب سے کہا۔ کیوں کیا ہوا؟ کیا چوہے کیلے نہیں کھاتے؟"

گیارام بولا۔ "اچھا کھاتے ہیں کھاتے ہیں مجھے کیلے نہیں چاہئیں پٹالی گڑ کے سندیش لے آ۔ کم نہ لانا۔ پیسے دیتا ہوں۔"

تائی پھر بھنڈار گھر میں گئی اور کچھ دیر تک جھوٹ موٹ ہنڈیا مٹکیاں ہلا ڈلا کر ڈر کے ساتھ بولی۔ ہائے سندیش بھی چوہے کھا گئے بیٹا۔ رتی بھر بھی نہیں چھوڑے نہ جانے کب ہنڈیا کا منہ کھلا چھوڑ گئی تھی، میری یاد پر پتھر۔۔۔"

گیارام نے تائی کی بات بھی پوری نہ ہونے دی۔ وہ لیکایک تیوریاں چڑھا کر چلا اٹھا۔ "پتالی گڑ کہیں چوہے کھاتے ہیں ڈائن! مجھ سے چالاکی! تیرے پاس کچھ تھا ہی نہیں تو تو نے مجھے بلایا کیوں"

تائی نے باہر آکر کہا۔ سچ کہتی ہوں گیا۔۔۔۔"

گیا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ بولا۔ پھر بھی کہہ رہی ہے سچ؟ جا میں تیرا کچھ بھی نہیں کھانا چاہتا۔" اتنا کہہ کر اس نے پیر سے سب سامان آنگن میں پھینک دیا اور کہا۔ "اچھا دیکھ اب میں مزہ چکھاتا ہوں

تجھے ؟" یہ کہتا ہوا وہ ایندھن کی لکڑی اٹھا کر بھنڈار گھر کی طرف چلا۔

گنگا منی "ہیں ہیں" کرتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ لیکن پل بھر میں غصہ میں بھرے ہوئے گیا رام نے ہنڈیا مٹکیاں سب توڑ تاڑ کر برابر کر ڈالیں اور اسے روکنے کی کوشش میں تائی کے ہاتھ میں تھوڑی سی چوٹ بھی لگ گئی۔

ٹھیک اسی وقت شیبو زمیندار کے یہاں سے واپس آیا شور وغل سن کر اس نے بلند آواز سے پوچھا کیا بات ہے ؟ گنگا منی شوہر کی آواز سنتے ہی رونے لگی اور گیا رام ہاتھ کی لکڑی پھینک کر سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا۔

شیبو نے برہم لہجے میں پوچھا "کیا بات ہے ؟"

گنگا منی نے روتے ہوئے کہا۔ گیا میرا سب کچھ توڑ پھوڑ کر ہاتھ میں لکڑی مار کر بھاگ گیا ہے۔ یہ دیکھو ہاتھ ورم کر آیا ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے شوہر کو اپنا ہاتھ دکھایا۔

شیبو کے پیچھے اس کا چھوٹا سالا کھڑا تھا چونکہ وہ ہوشیار اور پڑھا لکھا تھا۔ اس لئے زمیندار کے یہاں جاتے وقت شیبو اسے دوسرے کے محلے سے بلا کر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس نے کہا بھائی صاحب! یہ سب چھوٹے سامنت کی کارسازی ہے۔ لڑکے کو بھیج کر اسی نے یہ کام کروایا ہے۔ کیوں بہین یہی بات ہے نا!"

گنگا منی کا تو اس وقت کلیجہ جل رہا تھا۔ اس نے اسی وقت سر ہلا کر کہا "ٹھیک ہے بھیّا۔ اسی منہ جلے نے لڑکے کو سکھا کر

مجھے مار کھلائی ہے۔ اس کا کچھ ضرور ہونا چاہیئے نہیں تو میں رسّی لگا کر مر جاؤں گی۔"

اتنی دیر ہو چکی تھی اب تک شیبو کا نہانا کھانا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ زمیندار کے یہاں سے بھی ٹھیک فیصلہ نہیں ہوا۔ اس پر گھر میں قدم رکھتے ہی یہ ایک نیا اودھم۔ اب تو اسے نیک و بد میں بھی تمیز نہ رہی۔ اس لئے ایک بڑی قسم کھا کر کہا۔" یہ لو میں چلا۔ اب سیدھا تھانے کو۔ داروغہ کے پاس۔ اس کا مزہ نہ چکھایا تو میں برندابن سامنت کا بیٹا نہیں۔"

اس کا سالا پڑھا لکھا آدمی تھا اور گیا سے اس کی پہلے ہی سے دشمنی تھی۔ اس لئے کہا۔" قانوناً یہ دخل در معقولات ہے۔ لاٹھی لے کر کسی کے گھر پر چڑھ آنا، چیزیں توڑ دینا۔ عورتوں پر ہاتھ اٹھانا اس کی سزا ہے چھ ماہ کی قید، بھائی صاحب، تم تیار ہو جاؤ۔ اس کے بعد میں دکھا دوں گا کہ باپ بیٹا دونوں کیسے ایک ساتھ جیل میں ٹھونسے جاتے ہیں۔"

شیبو اب کچھ تامّل کئے بغیر سالے کا ہاتھ پکڑ کر سیدھا تھانے کو چل دیا۔

گنگامنی کو سب سے زیادہ غصّہ تھا۔ دیور اور دیورانی بھی اسی بات کو لے کر ایک زبردست طوفان کھڑا کرنے کی غرض سے اپنے دروازے کی زنجیر چڑھا کر اور ہاتھ میں جلانے کی ایک لکڑی لے کر شمبھو کے مکان کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور بلند آواز میں بولی "کیوں دیور جی! لڑکے سے مجھے مار کھلاؤ گے؟ اب باپ بیٹا دونوں

ایک ساتھ حوالات میں جاؤ۔"

شمبھو ابھی ابھی اپنے دوسرے بیاہ کے لڑکے کے ساتھ پھل آہار کر کے اٹھا ہی تھا۔ وہ بھاوج کی شکل اور اس کے ہاتھ میں جلتی لکڑی دیکھ کر گم سُم سا کھڑا رہا۔ بولا۔"ہوا کیا ہے۔ مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں۔"

گنگامنی نے منہ بنا کر جواب دیا۔ زیادہ بنو مت۔ رہنے دو۔ داروغہ صاحب آ رہے ہیں۔ ان کے سامنے کہنا۔ کچھ نہیں معلوم۔"

چھوٹی بہو گھر سے نکل کر ایک کھمبے کے سہارے چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔ شمبھو اندر ہی اندر ڈر گیا۔ اس نے گنگامنی کے پاس آ کر اس کا ایک ہاتھ تھام کر کہا۔ اپنی قسم کھاتا ہوں بڑی بہو ہم لوگ کچھ بھی نہیں جانتے۔"

اس بات کو گنگامنی خود بھی جانتی تھی کہ بات سچی ہے۔ مگر اس وقت فراخ دلی دکھانے کا موقع نہیں تھا۔ اس نے شمبھو کے منہ پر ہی اس پر الزام لگا کر جھوٹ اور سچ کی آمیزش کر کے گیارام کی کرتوت کی تفصیل سنائی۔ اس لڑکے کو جو جانتے ہیں ان کے لئے اس واقعہ پر یقین نہ کرنا دشوار تھا۔

مگر جو چھوٹی بہو نے اب اپنا منہ کھولا۔ اس نے اپنے شوہر سے کہا۔"کیسی ہوئی؟ جیسا کہا تھا ہو نہ گیا۔ کتنے دن سے کہہ رہی ہوں ادجی اس ڈاکو کو گھر میں نہ گھسنے دو۔ تمہارے چھوٹے بچے کو ناحق مار کر کسی دن خون کر ڈالے گا۔ مگر تم دھیان ہی میں نہیں لاتے۔ اب تو میری بات پکی ہو گئی نا؟"

شمبھو نے عاجزی کے ساتھ گنگامنی سے کہا۔"تمہیں میری قسم

ہے بھابھی۔ سچ بتاؤ۔ بھیّا سچ مچ تھانے چلے گئے کیا؟"
دیور کے نرم لہجے سے ذرا نرم ہو کر بڑی بہو نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "تمہاری قسم دیور جی گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہمارا بنجو بھی گیا ہے۔"
شمبھو بہت ہی ڈر گیا۔ چھوٹی بہو شوہر کی طرف خطاب کر کے کہنے لگی۔ "روز روز کہا کرتی ہوں۔ ندی کے اس پار کہیں پل بن رہا ہے۔ کتنے ہی لوگ کام کرنے جاتے ہیں۔ وہیں لے جا کر اسے بھی کام میں لگا دو وہ چابک لگائیں گے اور کام لیں گے۔ بھاگنے کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ دو ہی دن میں سیدھا ہو جائے گا۔ وہ تو ہوتا نہیں۔ اسکول بھیج رہے ہیں پڑھنے کو۔ لڑکا جیسے وکیل مختار ہی ہو جائے گا۔"
شمبھو نے منت آمیز لہجہ میں کہا۔ "ارے۔ وہاں کیا یونہی نہیں بھیجا۔ کیا سبھی وہاں سے گھر لوٹ سکتے ہیں؟ آدھے آدمی تو مٹی میں دب کر نہ جانے کہاں چلے جاتے ہیں کچھ پتہ ہی نہیں لگتا۔"
چھوٹی بہو نے کہا۔ "تو جاؤ۔ باپ بیٹا مل کر جا کر قید بھگتو۔"
بڑی بہو چپ تھی۔ شمبھو نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میں کل ہی چھوکرے کو لے جا کر یا بجرا کے پل کے کام میں لگا آؤں گا۔ بھابھی! بھیّا کو کسی طرح ٹھنڈا کر لو۔ آئندہ کبھی ایسا نہ ہو گا۔"
اس کی بیوی نے کہا۔ "لڑائی جھگڑا تو سب اسی لونڈے کے بارے میں ہوتا ہے۔ تم سے بھی تو کتنی مرتبہ کہا ہے جیجی۔ اسے گھر میں نہ گھسنے دیا کرو۔ زیادہ سر پر چڑھانا ٹھیک نہیں۔ میں کچھ کہتی نہیں۔ اسی لئے تو پچھلے مہینے تمہارے یہاں سے رات کو مرتبان کیلے کی گھر کو کون توڑ لایا تھا! اس ڈاکو کا کام تھا۔ پل کے کام پر بھیج دو۔ محلہ آرام کی نیند

سوئے گا۔"

شمبھو نے ماں کی قسم کھا کر کہا۔ کہ کل جیسے ہو گا لڑکے کو گاؤں سے نکال ہی کر وہ پانی پیئے گا۔

گنگا منی اس بات پر بھی کچھ نہ بولی ہاتھ کی لکڑی پھینک کر چپ چاپ گھر چلی گئی۔

شوہر بھائی ابھی تک کسی نے پانی نہیں پیا تھا۔ تیسرے پہر وہ اداس چہرہ سے انہیں کھلانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اسی وقت ادھر ادھر جھانکتا ہوا گیا رام اندر داخل ہوا۔ یہ معلوم کر کے کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اس نے ہمت کے ساتھ ٹھیک تائی کے پیچھے آ کر کہا "تائی۔"

تائی چونک پڑی۔ مگر بولی نہیں۔ گیا رام پاس ہی تھکا ہوا سا بیٹھ گیا۔ بولا "اچھا جو کچھ ہے۔ وہی دے۔ مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہے۔"

کھانے کی بات سن کر گنگا منی کا دبا ہوا غصہ بھر بھڑک اٹھا۔ انہوں نے گیا کی طرف دیکھے بغیر ہی غصّے کے ساتھ کہا "بے حیا منہ جلا پھر میرے پاس آیا۔ بھوک لگی ہے۔ دور ہو نکل یہاں سے۔"

گیا نے کہا "نکل جاؤں تیرے کہنے سے؟"

تائی نے ڈانٹ کر کہا "حرامزادے! پاجی! میں اب دوں گی تجھے کھانے کو!"

گیا بولا "تو نہیں دے گی تو کون دے گا! تو جو ہے کا نام لے کر جھوٹ کیوں بولی؟ کیوں صاف صاف نہیں کہہ دیا کہ بیٹا انہیں کو کھا لے

آج اور کچھ نہیں ہے۔ تب تو مجھے غصّہ نہ آتا۔ دے نہ جلدی ڈائن میرا پیٹ جلا جا رہا ہے۔"

تائی کچھ دیر خاموش رہی پھر دل میں کچھ نرم ہو کر بولی "بیٹ چلا جا رہا ہے۔ تو اپنی سوتیلی ماں کے پاس جا۔"

سوتیلی ماں کا نام سنتے ہی پل بھر میں گیا رام آگ بگولا ہو گیا کہنے لگا "اب میں اس کم بخت کا منہ نہ دیکھوں گا۔ میں تو صرف مچھلی پکڑنے کا کانٹا لینے گیا تھا۔ سو کہتی ہے نکل نکل۔ اب جا جیل کا بھات کھانے جا۔ میں نے کہا" میں تیرا بھات کھانے نہیں آیا۔ میں جاتا ہوں۔ تائی کے پاس۔ منہ جلی کیسی شیطان ہے؟ اسی نے جا کر اتنی الٹی سیدھی لگائی ہے۔ تبھی تو بابو جی نے آکر تیرے ہاتھ سے پتے چھینے تھے۔"

یہ کہہ کر اس نے زور سے زمین پر پاؤں ٹپکا اور کہا "ڈائن، تو اپنے آپ پتے لانے کیوں گئیں؟ جھوٹ موٹ کو جا کر اپنی عزت آپ کھوئی! مجھ سے کیوں نہیں کہہ دیا؟ اس بانس کے جھاڑ میں آگ لگا کر میں نے سب کا سب نہ جلا دیا تو میرا نام نہیں۔ دیکھ لینا۔ اس کمبخت نے مجھ سے کیا کہا۔ جانتی ہے تائی؟ کہا ہے کہ تیری تائی نے تھانے میں خبر دے دی ہے۔ داروغہ آکر تجھے باندھ لے جائیگا۔ جیل میں ٹھونس دیگا۔ سن لی۔ ابھاگی کی بات؟"

گنگامنی نے کہا "تیرے تاؤ بچو کو ساتھ لے کر تھانے تو گئے ہی ہیں۔ تو میرے اوپر ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اتنی ہمت تیری؟"

بچو ماما تو گیا بالکل ہی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھی اس میں شامل ہوا ہے سن کر اس کو آگ سی لگ گئی۔ بولا "تو کیوں غصہ کیوقت

مجھے روکنے دوڑی تھی؟"
گنگامنی نے کہا "اس لئے تو مجھے مارے گا۔کیوں؟ اب جا حوالات میں بند رہنا جا کر"
گیا نے ٹھینگا دکھا کر کہا "اونہہ۔ تو مجھے حوالات میں دے گی؟ دے نہ دے کر ذرا مزا دیکھ نا! آپ ہی رو رو کر مر مٹے گی۔ میرا کیا ہوگا؟"
گنگامنی نے کہا "میری بلا روتی ہے۔ جا میرے سامنے سے چلا جا۔ کہتی ہوں، دشمن کہیں کا"
گیا نے چلا کر کہا "تو پہلے کھانے کو دے نہ۔ تب تو جاؤں گا۔ صبح کو اٹھ کر دو دانے مُرمُرے ہی تو کھائے تھے۔ بھوک نہیں لگتی۔ مجھے کیا؟"
گنگامنی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی۔ اتنے میں شیبو پنجو کے ساتھ تھانے سے لوٹ آیا اور گیا پر نگاہ پڑتے ہی وہ بارود کی طرح جل اٹھا بولا ۔"حرامزادے!" پاجی کہیں کے۔ پھر میرے گھر آگھسا۔ نکل نکل یہاں سے پنجو پکڑ تو سؤر کو"
بجلی کی طرح گیا رام دروازے سے بھاگ کھڑا ہوا۔ چلاتا ہوا کہہ گیا "پنجوا سالے کی ٹانگ نہ توڑ دی تو میرا نام گیا نہیں"
پلک جھپکاتے ہی یہ سب باتیں ہو گئیں۔گنگامنی کو زبان ہلانے کا بھی موقع نہ ملا"
غصے میں بھرے ہوئے شیبو نے اپنی بیوی سے کہا۔ تیری شہ پا کر ہی تو ایسا ہو گیا ہے۔ آئندہ کبھی حرامزادے کو گھر میں گھسنے نہ دینا۔ تجھے بڑی بھاری قسم ہے"

پنجو نے کہا۔ جی جی۔ تمہارا کیا بگڑے گا؟ ہمارا ہی ستیا ناس ہوگا۔ کہیں راتوں رات چھپ کر ٹانگ پر لٹھ جما دے تو کوئی ٹھکانہ ہے؟"

شمبھو بولا" کل صبح ہی پولیس پیادے لاکر اسے بندھوا نہ دیا تو میرا ... وغیرہ وغیرہ

گنگا منی بت بنی بیٹھی رہی۔ ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔ ڈرپوک پنجو اس روز رات کو گھر ہی نہیں گیا وہیں سو رہا۔

دوسرے دن قریباً دس بجے ہوں گے کہ داروغہ صاحب باقاعدہ پالکی پر سوار ہو کر دو کوس چل کر کانسٹبلوں اور چوکیدار کے ساتھ موقع پر تحقیقات کرنے آپہنچے۔ دخل در معقولات، چیزوں کو نقصان پہنچانا۔ جلتی لکڑی سے عورت کو پیٹنا۔ وغیرہ وغیرہ بڑے جرم تھے۔ گاؤں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک زبردست ہل چل مچ گئی۔

بڑا ملزم باہر گیا تھا۔ اسے حکمت کے ساتھ پکڑ لیا گیا۔ پولیس کانسٹبلوں چوکیداروں وغیرہ کو دیکھتے ہی وہ رو دیا یا بولا" مجھے کوئی پھوٹی آنکھ بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اسی لئے تو یہ مجھے حوالات میں بھیجنا چاہتے ہیں۔"

داروغہ صاحب بوڑھے آدمی تھے ملزم کی عمر اور رونا دیکھ کر انہیں رحم آگیا۔ پوچھا" تمہیں کوئی پیار نہیں کرتا گیا رام؟"

گیا نے جواب دیا" صرف میری تائی مجھ کو پیار کرتی ہے اور کوئی نہیں۔ داروغہ نے سوال کیا۔ تب پھر تائی کو مارا کیوں؟ گیا رام نے جواب میں کہا۔ نہیں مارا نہیں ہے۔

کواڑ کی اوٹ میں گنگا منی کھڑی تھی۔ اس طرف دیکھ کر بولا۔

تجھے میں نے کب مارا ہے تائی؟

پنچو پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے ذرا ترچھی نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ "جی جی۔ حضور دریافت کر رہے ہیں۔ سچ بات کہنا۔ اس نے کل دوپہر کے وقت مکان میں گھس کر لکڑی سے تمہیں نہیں مارا تھا۔ دھرم اوتار کے سامنے جھوٹ مت بولنا۔"

گنگامنی نے مدھم آواز میں جو کچھ کہا پنچو نے اسی کو صاف لہجے میں دہرایا۔ "ہاں حضور میری بہین کہتی ہیں۔ اس نے مارا ہے۔"

گیارام آگ بگولا ہو کر چلا اٹھا۔ "دیکھ پنچو، میں نے تیرا پاؤں نہ توڑ ڈالا۔ تو . . . ." مارے غصہ کے اس کی بات بھی نہ پوری ہو سکی اور وہ رو دیا۔ پنچو جوش میں بھر کر بول اٹھا۔ "دیکھ لیا حضور۔ دیکھا آپ نے! حضور کے روبرو ہی کہہ رہا ہے پیر توڑ دے گا۔ حضور کے پیٹھ پیچھے تو خون کر سکتا ہے۔ اسے گرفتار کرنے کا حکم دے دیا جائے حضور۔"

داروغہ صاحب صرف ذرا مسکرا دئے۔

گیارام نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "میری ماں نہیں ہے۔ اسی لئے ورنہ . . . ."

اب کی بار بھی اس کی بات پوری نہ ہو سکی۔ جس کی حال اسے یاد تک نہیں۔ یاد کرنے کی کبھی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ آج آفت کے دن غیر متوقع طور پر اس ماں کو یاد کر کے وہ جھر جھر آنسو بہانے لگا۔

دوسرے ملزم شمبھو کے خلاف کوئی بات ثابت ہی نہیں ہوئی داروغہ صاحب عدالت میں نالش کرنے کا حکم دے کر رپورٹ

لے کر چلے گئے۔ پنچو نے مقدمہ چلانے اور باقاعدہ اس کی پیروی کرنے کی ساری ذمہ داری اپنے سر پر لے لی اور وہ چاروں طرف اس بات کا ڈھنڈورہ سا پیٹتا پھرا کہ اس کی بھینس کو بُری طرح زدوکوب کرنے کے جرم میں گیا کو قید بامشقت ہو جائے گی۔"

x x x x

مگر گیا بالکل لاپتہ ہے۔ پاس پڑوس کے لوگ شیبو کے اس طرزِ عمل کی بے حد مذمت کرنے لگے۔ شیبو ان سے لڑنے لگا۔ لیکن اس کی بیوی بالکل خاموش رہی۔ شیبو نے ایک پڑوسی سے سب حال سن کر غصہ کے ساتھ اپنی بیوی سے کہا "تم چپ چاپ سب سنتی رہی۔ کچھ جواب نہ دیا"

شیبو کی بیوی بولی "نہیں"

شبو نے کہا "میں گھر میں ہوتا تو اس عورت کو جھاڑو مار کر رخصت کرتا" بیوی بولی "تب آج سے تم گھر ہی میں بیٹھے رہا کرو اور کہیں نہ جایا کرو" یہ کہہ کر وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

اس روز دوپہر کو شبو گھر پر نہیں تھا۔ شمبھو آکر بانس جھاڑ سے چند بانس کاٹ کر لے گیا۔ کھڑ کھڑ کی آواز سن کر شبو کی بیوی نے باہر آکر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ مگر روکنا تو درکنار آج وہ پاس تک نہیں پھٹکی۔ چپ چاپ گھر لوٹ آئی۔

دو دن بعد شبو کو پتہ لگا تو وہ اچھلنے کودنے لگا۔ بیوی سے آکر بولا۔ "تیرے کیا کان پھوٹ گئے ہیں! گھر کے بغل سے وہ بانس کاٹ کر لے گیا اور تجھے کچھ معلوم ہی نہیں۔"

بیوی نے جواب دیا۔ کیوں؟ معلوم کیوں نہیں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔"

شبو نے غضبناک ہو کر کہا "تب بھی تو نے مجھ سے نہیں کہا؟"

گنگامنی بولی "کہتی کیا؟ بانس جھاڑ کیا اکیلے تمہارا ہی ہے؟ دیور جی کا اس میں حصہ نہیں ہے؟

شبو مارے حیرت کے دنگ رہ گیا بولا۔ کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے

اس روز شام کے بعد پنچو صدر عدالت سے لوٹ کر تھکا ہارا گھر پہنچا۔ شبو گائے بیلوں کے لئے گڑدی کاٹ رہا تھا۔ اندھیرا ہو رہا تھا اس لئے اس کے چہرے اور آنکھوں کی مسکراہٹ پر اس کی نگاہ نہیں پڑی۔ اس نے ڈرتے ہوئے پوچھا "کیا ہوا؟"

پنچو نے متانت انداز سے ذرا ہنستے ہوئے کہا "پنچو کے ہوتے ہوئے جو ہونا چاہیئے۔ وہی ہوا۔ ورانٹ نکلوا کر آ رہا ہوں۔ اب وہ ہے کہاں۔ معلوم ہو تے ہی بس۔"

شبو کے سر پر ایک ضد سی سوار ہو گئی تھی۔ کہنے لگا "چاہے جتنا خرچ ہو جائے۔ لونڈے کو ایک بار گرفتار کرانا ہی ہے۔ پہلے اسے جیل میں بھیج کر پھر کوئی اور کام کروں گا۔"

اس کے بعد دونوں میں طرح طرح کے مشورے ہونے لگے رات کے گیارہ بج گئے۔ مگر اندر سے کھانے کے لئے بلاوا نہ آتے دیکھ کر شبو کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے رسوئی میں جا کر دیکھا۔ چاروں طرف اندھیرا گھپ ہے۔

سونے کی کوٹھڑی میں جا کر دیکھا۔ بیوی زمین پر چٹائی بچھا کر

اس کے اوپر لیٹی ہوئی ہے۔

غصہ اور تعجب سے اس نے پوچھا۔ "کھانا تیار ہوگیا تو ہمیں بلایا کیوں نہیں؟"

گنگا منی نے آہستہ سے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "کس نے بنایا جو تیار ہوگیا؟"

شبو نے کڑک کر پوچھا۔ "بنایا ہی نہیں ابھی تک؟"

گنگا منی نے جواب دیا۔ "نہیں میری طبیعت اچھی نہیں ہے آج مجھ سے نہیں بنے گا۔"

مارے بھوک کے شبو کی آنتیں جل رہی تھیں۔ اس سے اب اور برداشت نہ ہو سکا۔ پڑی ہوئی بیوی کی پیٹھ پر ایک لات جماتے ہوئے کہا۔ "آج کل روز ہی طبیعت خراب رہتی ہے؟ نہیں بنے گا کیوں نہیں بنے گا تو جا، نکل جا گھر سے۔"

گنگا منی نہ تو کچھ بولی اور نہ تو اٹھ کر بیٹھی۔ جس طرح پڑی تھی اسی حالت میں پڑی رہی۔ اس روز رات کو سالے بہنوئی کسی نے بھی کچھ نہیں کھایا۔

صبح ہونے پر دیکھا گیا تو گنگا منی گھر میں نہیں ہے۔ ادھر ادھر کچھ ڈھونڈنے کھوجنے کے بعد بنچو نے کہا "جیجی ضرور ہمارے یہاں چلی گئی ہوں گی۔"

بیوی کے اس طرح یکایک بدل جانے کا سبب شبو دل ہی دل میں سمجھ گیا۔ چنانچہ ایک طرف اس کی جھنجلاہٹ دم بدم بڑھنے لگی، نالش اور مقدمہ کی طرف جھکاؤ بھی رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ اس نے

صرف اتنا کہا۔ چولھے میں جائے مجھے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔"

شام کو اطلاع ملی کہ گنگا منی میکے بھی نہیں گئی۔ پنچو نے امید دلا کر کہا۔" تو پھر ضرور بُوا کے گھر چلی گئی ہے۔"

اس کی ایک بُوا مالدار گھرانے میں بیاہی گئی تھی۔ وہ تقریباً پانچ چھ کوس کے فاصلے پر ایک گاؤں میں رہتی تھی۔ پوجا وغیرہ کی تقریبوں پر کبھی کبھی وہ گنگا منی کو آ کر اپنے ہاں لے جایا کرتی تھی۔ شبھو اپنی بیوی کو بہت زیادہ چاہتا تھا۔ اس نے زبان سے تو کہہ دیا کہ" جہاں خوشی ہو جانے دو مرنے دو۔" مگر اندر ہی اندر وہ پچھتا رہا تھا اور بیتاب ہو ہو جاتا تھا۔ اسی طرح غصّے میں چھ روز بیت گئے۔ ادھر کام کاج اور گائے بیلوں کے مارے گرہستی کا کام بالکل رُک سا گیا تھا۔ بالآخر یہ حالت ہو گئی کہ ایک روز بھی گذرنا مشکل ہو گیا۔

ساتویں روز وہ خود تو نہیں گیا مگر اپنی مردانگی کو گنگا میں بہا کر اس نے بُوا کے گھر بیل گاڑی بھیج دی۔

دوسرے روز خالی گاڑی دروازے سے آ لگی خبر ملی کہ وہاں بھی کوئی نہیں ہے۔ شبھو سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

تمام دن نہانا کھانا پینا کچھ بھی نہیں ہوا۔ مُردے کی طرح ایک تخت پر پڑا رہا اتنے میں پنچو نے انتہائی جوش کی حالت میں گھر میں گھس کر کہا۔" بھائی صاحب! پتہ لگ گیا۔"

شبھو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پوچھا۔" کہاں! کس نے خبر دی؟ کچھ بیمار تو نہیں ہوئی۔ گاڑی لے کر چل نہ۔ دونوں ابھی چلے چلیں۔" پنچو نے جواب دیا۔" بھیجی کی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ گیا کا پتہ لگ گیا۔"

شبو پھر لیٹ گیا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔
تب بنچو اسے طرح طرح سے سمجھانے لگا۔" اس موقع کو کسی طرح بھی ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ جیجی تو ایک نہ ایک دن آہی جائیں گی۔ مگر اس وقت اس بدمعاش کا ملنا مشکل ہو جائے گا۔
شبو نے اداس لہجے میں کہا۔" ابھی رہنے دو بنچو۔ پہلے وہ لوٹ آئے اس کے بعد ـــــ"
بنچو نے بات کاٹ کر کہا۔ اس کے بعد پھر کیا ہو گا بھائی صاحب! اس معاملے کو تو جیجی کے آنے سے پہلے ہی ختم کر ڈالنا چاہیئے۔ ان کے آجانے کے بعد شائد یہ کام نہ ہو سکے۔"
شبو راضی ہو گیا۔ مگر اپنے سونے گھر کی طرف دیکھ کر بدلہ لینے کا خیال اس کے دل میں کسی طرح آہی نہیں رہا تھا۔ اب بنچو ہی زور لگا کر اس سے کام لے رہا تھا۔
اگلے دن ابھی کچھ رات باقی تھی کہ وہ عدالت کے پیادے وغیرہ کو لے کر نکل پڑے۔ راستے میں بنچو نے سنایا" بڑی مشکل سے خبر ملی ہے۔ شمبھو نے اس کا نام بدل کر اسے پانچلا کے سرکاری پل کے کام میں بھرتی کرا دیا ہے۔ وہیں اسے گرفتار کرایا جائے گا۔"
شبو اب تک برابر خاموش رہا۔ اب بھی چپ سادھے رہا۔
جب یہ لوگ اس گاؤں میں داخل ہوئے تو دوپہر ہو چکی تھی۔ گاؤں کے ایک طرف بڑا بھاری میدان تھا۔ اس میں بہت سے آدمی لکڑی لوہا اور کل کے کارخانے کا سامان بھرا پڑا تھا۔ چاروں طرف چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں سی بنی ہوئی تھیں جن میں مزدور وغیرہ رہتے تھے

بہت پوچھ تاچھ کرنے پر ایک آدمی نے کہا ؎ جولڑکا صاحب کے بنگلہ میں لکھا پڑھی کرتا ہے۔ وہی تو؟ اس کا گھر وہ رہا ؎ یہ کہہ کر اس نے ایک چھوٹی سی جھونپڑی کی طرف اشارہ کر دیا۔ خیر یا کر وہ دبے پاؤں چپکے سے بمشکل جھونپڑی کے سامنے پہنچے۔ اندر گیا رام کی آواز سنائی دی پنچو خوشی کے مارے بھول گیا اور پیادے اور شبو کے ساتھ بہادرانہ انداز سے اچانک جھونپڑی کا دروازہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ مگر جونہی اس کی نظر اندر گئی۔ اس کا چہرہ حیرت۔ جلن اور مایوسی سے سیاہ پڑ گیا اس کی بھین تھالی میں بھات نکال کر ایک ہاتھ سے بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے اور گیا رام بیٹھا کھا رہا ہے۔

شبو کو دیکھتے ہی گنگا منی نے سر کا گھونگھٹ کھینچ کر صرف اتنا کہا "تم لوگ ذرا ٹھنڈے ہو کر ندی میں نہا آؤ۔ تب تک میں دوسرا چاول چڑھائے دیتی ہوں"

ہری چرن

اس کو آج کافی عرصہ گذر چکا ہے۔ تقریباً دس بارہ برس پہلے کا تذکرہ ہے۔ اس وقت درگا داس بابو وکیل نہیں ہوئے تھے۔ شائد تم ابھی درگا داس شرما سے اچھی طرح واقف نہیں۔ مگر میں تو انہیں بخوبی جانتا ہوں۔ آؤ تمہارا ابھی ان سے تعارف کرا دیں۔

کچھ دنوں سے ایک بے ماں باپ کا لاوارث کائستھ لڑکا نہ جانے

کہاں سے رام داس بابو کے یہاں آکر رہنے لگا تھا۔ سبھی لوگ کہتے یہ نیک اور عقلمند لڑکا ہے۔ درگا داس بابو کے پتا کا نوکر بہت پیارا اور خوبصورت ہے۔"

لڑکے کا نام ہری چرن تھا۔ چھوٹے بڑے تمام کام وہ خود کرنے کو تیار رہتا۔ گائے کو چارہ دینے سے لے کر رام داس بابو کے پاؤں دبانے تک سبھی کام وہ بڑے شوق سے کرتا ہر وقت کسی نہ کسی کام میں لگے رہنا بس یہی اسے پسند تھا۔

مالکن اکثر ہری چرن کے کام دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ کبھی کبھی وہ اسے ڈانتیں بھی کہتیں ۔"ہریا اور نوکر بھی تو ہیں۔ وہ کر لیں گے۔ تو ابھی لڑکا ہے تو کیوں اتنی محنت کرتا ہے؟"

ہری کی بعض اور خصوصیتیں بھی ہیں۔ اسے ہنسنا بہت پسند تھا وہ ہنس کر کہتا "ماں جی، ہم لوگ غریب آدمی ٹھیرے، ہمیں ہمیشہ محنت مزدوری کے سوا اور کرنا ہی کیا ہے؟"

اس طرح سکھ دکھ، لاڈ پیار اور کام دھندے میں ہری چرن نے تقریباً سال بھر گذار دیا۔

X X X X X

سُربالا رام داس بابو کی چھوٹی لڑکی تھی۔ تقریباً پانچ چھ برس کی اس کی عمر رہی ہوگی۔ سُربالا ہری چرن سے نہایت مانوس ہو گئی تھی دونوں میں خوب بنتی تھی، جب ماں بیٹی میں دودھ پلانے کے لئے کشاکش ہوتی اور بہت کچھ کہنے سننے کے بعد بھی جب وہ اس چھوٹی لڑکی کو دودھ پینے کیلئے آمادہ نہ کر سکتیں۔ جب دودھ پینے کی ضرورت

اوراس کے نہ پینے سے لڑکی کے جلدی مرجانے کے اندیشے سے پریشان ہوکر وہ غصّہ کے سبب جھلاکر زور سے لڑکی کے گال مسک دیتیں اور اس کے بعد بھی اسے دُودھ پینے کے لئے رضامند نہ کرسکتیں تو اس صورت حال میں بھی وہ ہری چرن کے کہنے سے دُودھ پی لیتی تھی۔

اوہ میں نے بہت سی فالتو بکواس کرڈالی۔خیر جانے دو اب مطلب کی بات کہتا ہوں سنو۔سمجھ لو کہ سربالا ہری چرن کو بہت پیار کرتی تھی۔جب درگا داس بابو کی عمر بیس سال کی تھی۔تب کی بات کہہ رہا ہوں۔اس وقت درگا داس بابو کلکتے ہی میں پڑھتے تھے گھر آنے میں بہت دقت تھی۔ پہلے سٹیمر پر چڑھو پھر دس بارہ کوس پیدل چلو۔بہت جھنجٹ کا راستہ تھا۔اس لئے درگا داس بہت کم گھر آتے تھے۔

لڑکا بی اے پاس کرکے گھر آیا ہے۔ماں بہت مشغول سی ہیں لڑکے کو اچھی طرح کھلانے پلانے۔خدمت اور پیار کرنے کے لئے گویا گھر کے تمام لوگ ایک ساتھ مضطرب ہو گئے تھے۔

درگا داس نے پوچھا ۔" ماں یہ لڑکا کون ہے؟"

ماں نے کہا۔" یہ ایک کائستھ کا لڑکا ہے۔اس کا باپ ماں کوئی نہیں، اسی لئے تمہارے پتا نے اسے رکھ لیا ہے۔نوکر کے سبھی کام کرتا ہے اور بڑا نیک ہے۔کوئی کچھ بھی کہے۔مگر ناراض نہیں ہوتا۔ بیچارے کے باپ ماں کوئی نہیں۔ابھی لڑکا ہی تو ہے۔ مجھے بڑا پیارا لگتا ہے۔"

گھر آکر درگا داس بابو کو پہلی بار ہری چرن کا یہ تعارف حاصل ہوا

خیر آج کل ہری چرن کو بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس سے خوش ہے ناراض نہیں۔ چھوٹے بابو (درگاداس) کو نہلانا۔ ضرورت کے مطابق لوٹے کا پانی رکھ دینا۔ وقت پر پانی کا ڈبہ حاضر کرنا۔ موقعہ پر حقّہ بھر لانا۔ ان تمام کاموں میں ہری چرن بہت ہوشیار تھا۔ درگا داس بابو بھی اکثر سوچا کرتے۔ لڑکا بڑا انیلیجنٹ ہے۔ لہٰذا دھوتی چننا۔ تمباکو بھرنا وغیرہ کا کام اگر ہری چرن نہ کرتا۔ تو درگاداس بابو کو وہ پسند ہی نہ آتے تھے۔

× × × ×

کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہاں کا پانی کہاں جا کر مرتا ہے۔ یاد ہے ایک بار ہم دونوں نے روتے روتے ایک بڑا ہمہ گیر اصول پڑھا تھا مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شائد وہ اصول تمام باتوں میں درست ثابت ہوتا ہے۔ کیا دنیا میں" کر بھلا ہوگا بھلا" "کر بھلا ہوگا بُرا" ہوتا ہی نہیں اگر تم نے نہ دیکھا ہو تو آؤ۔ آج تمہیں دکھادوں وہ"

مَیں نہیں کہتا کہ اوپر لکھی ہوئی بات سب کی سمجھ میں آہی جانی چاہئیے اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے اور نہ میرا یہ مقصد ہی ہے۔ کہ تمہیں فلاسفی کی تعلیم دوں۔ پھر بھی آپس میں دو باتیں کہہ رکھوں تو حرج ہی کیا ہے!"

آج درگاداس بابو کو کسی بڑی دعوت میں جانا ہے۔ گھر نہ کھائینگے شائد لوٹنے میں بہت رات بھی ہو جائے گی۔ اس لئے روز کام کاج کر کے ہری چرن کو سو جانے کے لئے کہہ گئے ہیں"

اب ہری چرن کی بات بیان کرتا ہوں۔ درگاداس بابو رات کو باہر

والے کمرے میں سوتے تھے اور اس کی وجہ سب لوگوں کو نہیں معلوم تھی میرے خیال میں عورت کے میکے چلے جانے پر باہر سونا ہی انہیں زیادہ پسند تھا رات کو چھوٹے بابو کے لئے بستر بچھانا۔ سونے کے بعد ان کے پاؤں دبانا وغیرہ کام ہری چرن کے ذمہ تھے۔ جب وہ اچھی طرح سو جاتے تو ہری چرن بھی بغل کی کوٹھڑی میں جا کر سو جاتا۔

شام ہونے کے پہلے ہی سے ہری چرن کے سر میں درد ہونے لگا وہ سمجھ گیا کہ اب بخار آنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ درمیان درمیان میں اکثر اسے بخار آجایا کرتا تھا۔ اس لئے اس کے ابتدائی آثار سے بخوبی واقف تھا۔ جب ہری چرن سے بالکل نہیں بیٹھا گیا۔ تو وہ جا کر سو رہا۔ اسے اس بات کا ہوش تک نہ رہا کہ ابھی چھوٹے بابو کا بستر بچھانا باقی ہے رات کو سب نے کھایا پیا۔ مگر ہری چرن کھانے نہیں آیا۔ اس کی "ماں جی" اسے دیکھنے آئیں۔ بدن پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ کافی گرم تھا۔ وہ سمجھ گئیں بخار آگیا ہے۔ اس لئے اسے تنگ کئے بغیر چلی گئیں"

رات کے تقریباً بارہ ایک بج رہے ہوں گے۔ دعوت کھا کر چھوٹے بابو گھر آئے۔ دیکھا تو بستر تک نہیں بچھا تھا۔ ایک تو نیند آرہی تھی۔ دوسرے راستے بھر یہ سوچتے آرہے تھے کہ گھر چل کر اطمینان سے سو جائیں گے۔ ہریا ان کے تھکے ہوئے پیروں سے جوتے نکال کر انہیں آہستہ آہستہ دباتا جائے گا اور اس آرام میں کچھ نیند کا لطف اٹھاتے ہوئے فرشی کا نیچہ منہ سے لگا کر وہ ایک ساتھ دیکھیں گے کہ صبح ہو گئی ہے

بالکل مایوس ہو کر وہ بہت بگڑے اور نہائت غصہ سے دو چار بار زور زور سے پکارا۔ ہری۔ ہریا۔ اے ہریا! ہریا ہو۔ تب تو بولے۔

بیچارہ بخار میں بیہوش پڑا تھا۔ تب درگا داس بابو نے سوچا۔ معلوم ہوتا ہے نالائق سو گیا۔ کوٹھڑی میں جا کر دیکھا۔ وہ سچ مچ چادر اوڑھے پڑا تھا۔ تو ان سے برداشت نہ ہوا۔ انہوں نے زور سے بال پکڑ کر اسے اٹھا کر بٹھانے کی کوشش کی۔ مگر وہ پھر پہلے کی طرح لیٹ گیا۔ اب تو بابو کو بہت غصہ آیا وہ بدحواس ہو گئے۔ انہوں نے ہریا کی پیٹھ پر زور سے جوتے کی ایک ٹھوکر رسید کی۔ اس سخت چوٹ سے وہ ہوش میں آ گیا۔ اور اٹھ بیٹھا۔ درگا داس بابو نے کہا۔ "چھوٹے بچوں کی طرح سو گیا ہے کیا میں بستر بچھاؤں گا؟" یہ کہتے ہوئے ان کا غصہ اور بڑھ گیا اور انہوں نے دو تین بیت اور رسید کر دئے۔

رات کو جب ہری پاؤں دبا رہا تھا۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ گرم پانی کی ایک بُوند بابو کے پیروں پر گری تھی۔

X X X X X

تمام رات درگا داس بابو کو نیند نہیں آئی۔ پانی کی وہ ایک بوند انہیں بڑی گرم معلوم ہوئی۔ ہری چرن کو وہ بہت پیار کرتے تھے اپنی نیک مزاجی کے باعث وہ انہیں کا سبھی مرکز محبت تھا۔ خصوصاً اس مہینے بھر کے ربط و ضبط سے وہ اور بھی ہر دلعزیز بن گیا تھا۔

رات کو انہوں نے کئی مرتبہ سوچا کہ وہ ایک بار جا کر دیکھ آئیں کہاں چوٹ لگی ہے، کتنا ورم ہے۔ مگر وہ نوکر ہے اس لئے کیا ان کا جانا مناسب ہوگا؟ کئی مرتبہ سوچا چل کر ذرا اتنا تو دریافت کر لیں۔ کہ بخار میں کچھ کمی ہوئی۔ لیکن اس کے پاس جانے میں انہیں شرم محسوس ہوتی تھی۔"

صبح ہری چرن نے بابو کو ہاتھ منہ دھونے کے لئے پانی لا دیا اور فرشی

سُلگاکر رکھ گیا۔ درگاداس بابو اس وقت بھی پُوچھ لیتے اور تسکین کے دوایک لفظ کہہ دیتے وہ تو ابھی لڑکا ہے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے تیرہ سال کا بھی تو نہ ہو گا۔ لڑکا ہی سمجھ کر ایک مرتبہ پاس بلاکر دیکھ لیتے۔ بیت کہاں لگی ہے؟ خون کیسے جم گیا ہے؟ بوٹ جوتے کی ٹھوکر سے کتنا ورم ہو گیا ہے۔ آخر وہ لڑکا ہی تو ہے۔ اس سے اس قدر شرم کرنے کی کون سی بات تھی؟"

کوئی نو بجے کے قریب کہیں سے ایک تار آیا۔ تار کی آمد نے درگاداس بابو کو پریشان کر دیا۔ وہ گھبرا گئے۔ لفافہ چاک کر کے پڑھا۔ بیوی سخت بیمار تھیں۔ یکایک ان کا دل بیٹھ گیا وہ اسی روز کلکتہ چلے گئے۔ گاڑی پر سوار ہوتے ہی وہ سوچنے لگے۔ بھگوان کہیں پراشچت (کفارہ) تو نہیں ہو رہا ہے؟"

تقریباً ایک مہینہ گذر گیا۔ درگاداس بابُو کا چہرہ آج بہت بشاش تھا۔ ان کی بیوی نے نئی زندگی پائی مرتے مرتے بچی۔ آج اسے غذا دی گئی تھی۔

آج گھر سے ایک خط آیا۔ درگاداس بابُو کے چھوٹے بھائی نے خط لکھا تھا۔ آخر میں مکرر کے بعد لکھا تھا: "بڑے افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ کل صبح بخار ہی کی حالت میں ہری چرن مر گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے کئی بار آپ کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔"

آہ! بے ماں باپ کا لاوارث لڑکا! درگاداس بابو نے خط کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔"

ہری لچھمی

جس بات کی بنا پر اس کہانی کی تخلیق ہوئی۔ وہ چھوٹی سی ہے۔ پھر بھی چھوٹی سی بات سے ہری لچھمی کی زندگی میں جو انقلاب ہو گیا وہ نہ چھوٹا ہی ہے نہ حقیر ہی، دنیا میں ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ بیل پور کے دو شریک (زمینداری کے حصے دار) پُرسکون ندی کے کنارے جہاز کے پاس چھوٹی کشتی کی طرح باہم ایک دوسرے کے قریب کسی آویزش کے بغیر بندھے تھے۔ یکایک نہ جانے کہاں سے ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ جہاز کا رسّہ کٹا اور لنگر ٹوٹ کر الگ ہو گیا۔ ساتھ ہی بیک لمحہ وہ چھوٹی سی کشتی نہ جانے کیسے نیست و نابود ہو گئی۔ تلاش کے باوجود اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔

بیل پور کا تعلقہ کچھ بڑا نہیں۔ اٹھتے بیٹھتے رعیتوں کو مار پیٹ کر سال میں بارہ ہزار سے زیادہ وصولی نہیں ہوتی۔ اس لئے ساڑھے پندرہ آنے کے حصے دار وِپن بہاری کا موازنہ۔ اگر جہاز کے ساتھ چھوٹی کشتی سے کی ہے تو شاید اس میں کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔

دُور کا رشتہ ہونے کے باوجود دونوں ہم قوم تھے اور چھ سات پشت پہلے دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ لیکن آج ایک کا سہ منزلہ مکان گاؤں کے سر پر کھڑا تھا۔ اور دوسرے کا کمزور مٹیالا گھر دن بہ دن زمین پر بچھ جانے کے لئے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

پھر بھی کسی طرح دن گذر رہے تھے۔ وپن کے بقیہ ایام بھی کسی نہ کسی طرح آرام و تکلیف میں چپ چاپ بسر ہو سکتے تھے۔ لیکن بادل کے جس معمولی ٹکڑے سے یکایک خوفناک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا۔ وہ اس طرح ہے۔

ساڑھے پندرہ آنے کے حصے دار شیو چرن کی بیوی کی یکایک موت ہو جانے پر ان کے دوستوں نے کہا۔ "چالیس اکتالیس بھی کیا کوئی عمر میں عمر ہے۔ تم دوسری شادی کرو۔" دشمن فریق کے لوگ سن کر ہنسنے لگے۔ بولے۔ شیو چرن کی چالیسی تو چالیس برس پہلے ہی پار ہو چکی ہے۔ غرضیکہ دونوں میں سے کوئی بھی بات سچ نہ تھی اصل بات یہ تھی کہ بڑے بابو کا خوب گورا مضبوط جسم تھا بھرے ہوئے چہرے پر بالوں کا نشان تک نہ تھا۔ ہر وقت ڈاڑھی مونچھ منڈائے رکھنے سے کچھ سہولیت تو ہو سکتی ہے لیکن دقتیں بھی کافی بڑھ جاتی ہیں عمر کا اندازہ لگانے کے متعلق جو نیچے کی طرف نہیں جانا چاہتے۔ ویسی طرف وہ گنتی کے کس کوٹھے میں جا کر ٹھیریں گے۔ اس کا خود ہی انہیں کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔ خیر کچھ بھی ہو۔ دولتمند مرد کی شادی کسی ملک میں عمر کے پیچھے نہیں رکتی۔ پھر بنگال میں کیوں۔ کہنے لگے؛ قریب ڈیڑھ مہینہ تو رنج و افسوس اور نہیں نہیں کرتے کراتے بیت گیا۔ اس کے بعد شیو چرن ہری لچھمی کو بیاہ کر اپنے گھر لے آئے کیونکہ مخالف فریق والے خواہ کچھ بھی کیوں نہ کہتے رہیں۔ یہ بات ماننی ہی پڑے گی کہ بڑھاپے کی شادی کے دیوتا، سچ مچ ہی ان پر نہایت خوش تھے ان لوگوں نے بے شبہ وطور پر ماتم پیت کی؛

یہ بات نہیں کہ دولھا کے مقابلے میں نئی دولھن کی عمر بالکل ہی غیر موزوں ہو۔ مگر ہاں دو ایک بال بچے لے کر گھر آتی تو پھر کہنے سننے کی کوئی بات ہی نہ رہ جاتی۔ لیکن اس بات کو سبھی نے قبول کیا کہ وہ خوبصورت ہے مطلب یہ ہے کہ عموماً بڑی عمر کی لڑکیوں سے بھی لچھمی کی عمر زیادہ ہو گئی تھی شاید انیس سے کم نہ ہوگی۔ اس کے باپ جدید خیال کے اصلاح پسند آدمی تھے۔ انہوں نے بڑی کوشش سے لڑکی کو زیادہ عمر تک تعلیم دیکر میٹرک پاس کرایا تھا۔ ان کی خواہش تو کچھ اور ہی تھی۔ صرف تجارت کے ناکام ہو جانے اور اچانک افلاس میں مبتلا ہو جانے کے سبب انہیں ایسے لڑکے کو لڑکی دینے کے لئے مجبور ہونا پڑا تھا۔

لچھمی شہر کی لڑکی ٹھیری۔ اس نے دو چار ہی دنوں میں شوہر کو پہچان لیا۔ اس لئے دشواری یہ پیش ہوئی کہ عزیز و اقارب اور دوسرے بہت سے مہمانوں سے بھرے ہوئے اس بڑے گھر میں وہ جی کھول کر کسی سے ہل مل نہ سکی۔ ادھر شیو چرن کی محبت کی تو کوئی حد ہی نہ تھی صرف بوڑھے شوہر کی نوجوان بیوی ہی ہونے کے سبب نہیں بلکہ اسے تو گویا! اکبارگی بیش بہا شے مل گئی۔

گھر کے لوگ نوکر چاکر اور عورتیں کچھ طے نہ کر سکے کہ کیسے اس کی مزاج پرسی کریں۔ لیکن ایک بات وہ اکثر سنا کرتی تھی "اب منجھلی بہو کے منہ پر کالک لگ گئی۔ حسن و جمال میں قابلیت و شعور میں عقل و دانش میں ہر ایک بات میں اس کا شیشہ غرور چور ہوگیا

مگر اتنا کرنے پر بھی کچھ نہ ہو سکا۔ دو ہی مہینے کے اندر لچھمی بیمار پڑ گئی اس بیماری کی حالت ہی میں ایک روز منجھلی بہو کے ساتھ اسکی ملاقات

ہوئی۔ منجھلی بہو سے مراد ہے وپن کی بیوی، بڑے گھر کی نئی بہو کے بخار کی خبر سن کر وہ دیکھنے آئی تھی۔ عمر میں شائید وہ تین سال بڑی ہو گی اس بات کو دل ہی دل میں لچھمی نے بھی قبول کیا کہ وہ حسین ہے۔ لیکن اس عمر میں اس کے تمام جسم پر افلاس کی شدید چوٹ کے نشان صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ میں چھ سات سال کا ایک لڑکا تھا وہ بھی دُبلا پتلا۔ لچھمی قدر کے ساتھ اپنے بچھونے پر ایک طرف بیٹھنے کے لئے جگہ بنا کر کچھ دیر تک چُپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ ہاتھ میں دو دو سونے کی چوڑیوں کے سوا تمام جسم پر اور کوئی زیور نہیں تھا اور لباس میں ادھ میلی لال کنارے کی دھوتی تھی۔ شائید وہ اس نئے شوہر کی ہو گی۔ گاؤں کے رواج کے مطابق لڑکا برہنہ نہیں تھا۔ اس کی کمر میں بھی ایک رنگی ہوئی چھوٹی دھوتی تھی۔

لچھمی نے منجھلی بہُو کا ہاتھ آہستہ سے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "خوش قسمتی سے بخار آ گیا، جبھی تو آپ سے ملاقات ہو سکی۔ مگر رشتے میں مَیں جیٹھانی ہوتی ہوں منجھلی بہو! سنا ہے کہ منجھلے دیور جی ان سے بہت چھوٹے ہیں۔

منجھلی بہُو نے متبسّم چہرے سے کہا "رشتے میں چھوٹی ہونے پر کیا آپ کہا جاتا ہے؟"

لچھمی نے کہا "بس پہلے روز جو کہا۔ وہ کہہ دیا۔ نہیں تو میں آپ کہنے والی نہیں ہوں مگر تم بھی مجھے "جیجی" نہیں کہہ سکتیں۔ یہ مجھ سے برداشت نہ ہو گا۔ میرا نام لچھمی ہے۔"

منجھلی بہُو نے کہا "نام بتانے کی ضرورت نہیں جیجی۔ آپ کو دیکھتے

ہی معلوم ہو جاتا ہے اور میرا نام نہ جانے کس نے مذاق میں کملا رکھ دیا تھا۔ یہ کہہ کر وہ ذرا ہنس پڑی۔

ہری لچھمی کے جی میں آیا۔ وہ بھی جواب میں کہے کہ تمہاری طرف دیکھتے ہی تمہارا نام معلوم ہو جاتا ہے لیکن وہ اس ڈر سے نہ کہہ سکی کہ ایسا کہنا نقل کی طرح سنائی دے گا۔ بولی "ہم دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ لیکن منجھلی بہو میں تم سے "تم" کہہ سکی لیکن تم سے "تم" نہیں کہتے بنا۔"

منجھلی بہو نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ فوراً منہ سے نکلتا نہیں جیجی۔ صرف عمر کے سوا اور سبھی باتوں میں آپ مجھ سے بڑی ہیں۔ ابھی دو چار دن جانے دو۔ ضرورت پڑنے پر بدلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

ہری لچھمی کی زبان پر یکایک اس کا کوئی جواب تو نہیں آیا۔ لیکن وہ دل ہی دل میں سمجھ گئی کہ یہ عورت پہلے دن کے تعارف کو زیادہ گہرا نہیں بنانا چاہتی۔ مگر اس کے کچھ کہنے کے پہلے ہی منجھلی بہو اٹھنے کی تیاری کر کے بولی "تو اب اٹھتی ہوں جیجی کل پھر......"

ہری لچھمی حیران ہو کر بولی۔ ابھی کیسے چلی جاؤ گی۔ ذرا بیٹھو۔"

منجھلی بہو نے کہا۔ آپ حکم دیں گی تو بیٹھنا ہی پڑے گا۔ لیکن آج جانے دیجئے جیجی۔ ان کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔" یہ کہتی ہوئی وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر جانے کے پہلے ہنستی ہوئی بولی جاتی ہوں جیجی۔ کل ذرا سویرے ہی چلی آؤں گی۔ کیوں؟ یہ کہہ کر وہ آہستہ سے باہر نکل گئی۔

وپن کی بیوی کے چلے جانے کے بعد ہری لچھمی اس طرف دیکھتی ہوئی

چپ چاپ پڑی رہی۔ اب بخار نہیں تھا۔ لیکن اس کی پشیمانی موجود تھی۔ پھر بھی کچھ دیر کے لئے وہ سب کچھ بھول گئی۔ اب تک گاؤں بھر کی اتنی بہو بیٹیاں آئی ہیں جن کا شمار نہیں لیکن بغل والے غریب گھر کی اس بہو کے ساتھ ان کا کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا وہ اپنے آپ آئیں اور اٹھنا ہی نہیں چاہتی تھیں اور بیٹھنے کیلئے کہا گیا تو پھر کہنا ہی کیا۔ وہ کتنی زبان دراز اور کتنی باتونی تھیں وہ مذاق کرنے کے لئے کس شرمناک حد تک تیار تھیں۔

بوجھ سے دبا ہوا اس کا دل رہ رہ کر بغاوت کے لئے مضطرب ہو جاتا تھا لیکن انہیں میں سے یکایک یہ کون اس کے بستر علالت کے قریب آئی اور کچھ لمحات کے لئے اپنا ایسا تعارف کرا گئی؟ اسکے میکے کا حال پوچھنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ لیکن بغیر پوچھے ہی نچھمی نہ جانے کیسے سمجھ گئی کہ اس کی طرح وہ کلکتے کی لڑکی ہرگز نہیں۔ دین کی بیوی کے متعلق مشہور ہے کہ گاؤں کی رہنے والی ہونے کے باوجود وہ پڑھی لکھی ہے۔ نچھمی نے سوچا۔ ممکن ہے۔ نچھمی ہو آواز کے ساتھ رامائن مہابھارت پڑھ سکتی ہو۔ لیکن اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتی۔ جس باپ نے دین جیسے غریب اور مفلس کے ہاتھوں میں اپنی لڑکی سونپی ہے۔ اپنے گھر پر ماسٹر رکھ کر اور اسکول میں پڑھا کر پاس کرا کے لڑکی کو نہ بیاہا ہو گا۔ سانولا سلونا رنگ ہے لیکن اسے گورا نہیں جا سکتا۔ حسن کی بات چھوڑ دو۔ تعلیم و تربیت، خیر کسی بات میں بھی تو دین کی بیوی اس کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ لیکن ایک بات میں نچھمی نے اپنے گویا اس سے چھوٹا

سمجھا۔ وہ تھی اس کے گلے کی آواز۔ گویا وہ نغمہ ہو۔ اور بات کرنے کا انداز تو گویا شہد سے لبریز تھا۔ اس میں نام کو بھی جمود نہ تھا۔ اتنی سادہ اور آسان بات چیت تھی۔ اس کی گویا وہ گھر سے باتیں یاد کرلائی رہی ہوں۔ لیکن سب سے زیادہ جس چیز نے اسے باندھ لیا۔ وہ اس کا بعد تھا۔ اس بات کو کہ وہ غریب گھر کی بہو ہے۔ منہ سے نہ کہنے پر بھی وہ اس ڈھنگ سے ظاہر کرگئی گویا یہی اسے پسند ہے جیسے اس کے سوا اور کچھ اسے نہیں بھاتا۔ یہ بتانے کے سوا اور کسی مقصد کا اس میں شائبہ تک نہ تھا کہ وہ غریب ہے۔ مگر کنگال نہیں ایک بھلے گھر کی بہو دوسرے گھر کی ایک بیمار بہو کو دیکھنے آئی ہے شام کو جب پتی دیکھنے آئے تو ہری لچھمی نے دوسری باتیں کرنے کے بعد کہا۔ "اس گھر کی منجھلی بہو سے آج ملاقات ہوئی تھی۔" شیو چرن نے کہا کس سے؟ دین کی بہو سے؟"

ہری لچھمی نے کہا۔ "ہاں۔ میری قسمت اچھی تھی جو اتنے دنوں بعد خود ہی مجھے دیکھنے آئی تھی۔ لیکن پانچ منٹ سے زیادہ نہیں ٹھیری۔ کام تھا۔ اس لئے چلی گئی۔"

شیو چرن نے کہا۔ "کام! ارے ان لوگوں کے گھر کوئی نوکر نوکرانی تھوڑے ہی ہے۔ برتن صاف کرنے سے لے کر دیگچی چڑھانے تک تمام کام اسے اپنے ہاتھ سے کرنے پڑتے ہیں۔ بھلا تمہاری طرح پڑے پڑے بیٹھے بیٹھے آرام کرتو لے کوئی۔ ایک گلاس پانی تک تو تمہیں اپنے ہاتھ سے اونڈیل کر نہیں پینا پڑتا۔"

اپنے متعلق ایسی رائے ہری لچھمی کو بہت ہی بری معلوم ہوئی

مگر یہ سمجھ کر کہ وہ غصّہ نہیں ہوئی کہ بات تو اس کی بڑائی کرنے کیلئے کہی گئی تھی۔ توہین کرنے کی غرض سے نہیں۔ بولی "مجھتا ہے کہ منجھلی بہو کو بڑا گھمنڈ ہے۔ اپنا گھر چھوڑ کر کہیں آتی جاتی نہیں"

شیو چرن نے کہا "جائے گی کیسے؟ ہاتھوں میں دو چوڑیوں کے سوا خاک پتھر کچھ پاس میں ہے بھی؟ مارے شرم کے منہ نہیں دکھا سکتی۔ ہری لچھمی نے ذرا ہنس کر کہا "اس میں شرم کس بات کی؟ دنیا کے لوگ کیا اس کے بدن پر جڑاؤ زیورات دیکھنے کے لئے بیقرار ہو رہے ہیں؟ جو نہ دیکھیں گے تو چھی چھی کریں گے"

شیو چرن نے کہا۔ جڑاؤ زیورات! میں نے جو تمہیں دئے ہیں، کسی سالے کے بیٹے نے ویسے آنکھوں سے دیکھے بھی ہیں؟ اپنی بیوی کو آج تک دو چوڑیوں کے سوا اور کچھ بنوا کر نہ دے سکا۔ حول ہوں بابو روپے کا زور بڑا زور ہے جوتا ماروں گا اور . . . "

ہری لچھمی خفیف اور نہایت شرمندہ ہو کر بولی۔ "چھی چھی ایسی بات کیوں کہتے ہو؟"

شیو چرن نے کہا "نہیں نہیں ہمارے پاس دبی چھپی بات نہیں جو کچھ کہوں گا۔ وہ صاف صاف کہہ دوں گا"

ہری لچھمی چپ چاپ آنکھیں بند کئے پڑی رہی اور کہنے کو تھا ہی کیا؟ یہ لوگ کمزوروں کے خلاف نہایت غیر مہذب بات سخت اور تلخ لہجے میں کہنے ہی کو صاف گوئی سمجھتے ہیں۔ شیو چرن خاموش نہ رہا۔ کہنے لگا "بیاہ میں جو پانچ سو روپے قرض لئے تھے۔ وہ مع سود اور اصل کے سات سو ہو گئے اس کا بھی کچھ خیال ہے؟

غریب ہے ایک کنارے سے پڑا ہے پڑا رہ۔ ارے میں چاہوں تو
کان پکڑ کر باہر نکال سکتا ہوں جو نوکرانی کے لائق نہیں۔ وہ میری
بیوی کے سامنے گھمنڈ کرتی ہے۔"
ہری لچھمی کروٹ بدل کر سو رہی۔ ایک تو بیمار، اس پر غصہ اور
شرم سے اس کے سارے بدن میں گویا اندر سے کپکپی پیدا ہونے
لگی۔ دوسرے روز دو پہر کو گھر میں ہلکی آواز سن کر ہری لچھمی نے
آنکھ کھول کر دیکھا تو وپن کی بیوی چپکے سے باہر جا رہی ہے اس نے
بلا کر کہا "منجھلی بہو! چلی کیوں جا رہی ہو۔"
منجھلی بہو نے شرماتے ہوئے لوٹ کر کہا "میں نے سوچا آپ
سو رہی ہیں۔ آج کیسی طبیعت ہے جیجی؟"
ہری لچھمی نے کہا۔ آج بہت اچھی ہوں۔ ہاں آج تم اپنے ملاّ کو
نہیں لے آئیں؟"
منجھلی بہو نے کہا "آج وہ اچانک سو گیا جیجی۔"
اچانک سو گیا۔ اس کا کیا مطلب؟
عادت خراب ہو جائے گی۔ اس لئے دن میں اسے نہیں سونے
دیتی جیجی۔"
ہری لچھمی نے پوچھا۔ گھر میں اودھم کرتا نہیں پھرتا؟
منجھلی بہو نے کہا "کیوں نہیں کرتا پھرتا! مگر دوپہر کو سونے
کے مقابلے میں وہ نہیں اچھا۔"
تم خود شاید نہیں سوتیں؟"
منجھلی بہو نے ہنستے ہوئے سر ہلا کر کہا۔ نہیں۔"

ہری لچھمی نے سوچا تھا۔ عورتوں کے عادت کے مطابق اب کی بار شائد وہ اپنی عدیم الفرصتی کی بھی فہرست سنانے بیٹھ جائیگی مگر اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس کے بعد اور دوسری باتیں ہونے لگیں۔ باتوں ہی باتوں میں ہری لچھمی نے اپنے میکے کی بات۔ بھائی بھین کی بات۔ ماسٹر صاحب کی بات۔ اسکول کی بات یہانتک کہ اپنے میٹرک۔ پاس کرنے کی بات بھی کہہ ڈالی۔ بہت دیر بعد جب اسے ہوش آیا۔ تو اس نے صاف دیکھا کہ منجھلی بہو سننے والی کے لحاظ سے چاہے جتنی اچھی کیوں نہ ہو۔ بولنے والی کے لحاظ سے وہ کچھ بھی نہیں۔ اپنی بات اس نے تقریباً کچھ کہی ہی نہیں۔ پہلے تو لچھمی کو شرم معلوم ہوئی مگر اس وقت اسے پتہ چلا کہ غپ شپ کرنے لائق اس کے پاس ہے ہی کیا۔ مگر کل جیسے اس بہو کے خلاف اس کا دل ناخوش ہوگیا تھا۔ آج ویسے ہی اسے بہت تسکین و مسرت سی محسوس ہوئی۔

دیوار پر آویزاں قیمتی گھڑی میں مختلف قسم کے باجوں کے ساتھ تین بجے۔ منجھلی بہو اٹھ کھڑی ہوئی اور عاجزی کے ساتھ بولی۔ "جیجی اب چلتی ہوں"

لچھمی نے اشتیاق کے ساتھ کہا۔ بھین! کیا تمہیں تین ہی بجے تک چھٹی رہتی ہے؟ کیا لالہ جی گھڑی دیکھ کر ٹھیک وقت سے گھر آتے ہیں؟"

منجھلی بہو نے کہا "آج وہ گھر ہی پر ہیں"

"پھر جلدی کس بات کی بیٹھو نہ تھوڑی دیر اور"

منجھلی بہو نہیں بیٹھی۔ لیکن جانے کے لئے پاؤں بھی نہ بڑھا سکی
آہستہ سے بولی۔ "جیجی! آپ نے کہاں تک تعلیم پائی ہے۔ کتنا پڑھا
لکھا ہے اور میں ٹھیری گاؤں دیہات کی . . . "

"کیا تمہارا میکہ گاؤں میں ہے؟"

"ہاں جیجی۔ بالکل دیہات ہیں۔ بغیر سمجھے کل کیا کہنے کو اور کیا
کہہ دیا۔ لیکن آپ کی توہین کرنے کے لئے نہیں۔ آپ مجھے جیسی بھی
قسم کھانے کے لئے کہیں جیجی۔"

ہری لچھمی دنگ رہ گئی۔ بولی "ایسا کیوں کہتی ہو۔ منجھلی بہو تم
نے کل کوئی ایسی بات تو نہیں کہی۔"

منجھلی بہو نے پھر اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ لیکن "چلتی ہوں"
کہہ کر جب وہ دوبارہ رخصت ہو کر آہستہ آہستہ جانے لگی تو اس
کی آواز غیر متوقع طور پر کچھ اور ہی قسم کی سنائی دی۔

رات کو جب شیو چرن گھر آئے۔ تو ہری لچھمی چپ چاپ لیٹی
ہوئی تھی۔ طبیعت مقابلتاً اچھی تھی۔ دل بھی خوش اور مطمئن تھا
شیو چرن نے پوچھا۔ کیسی طبیعت ہے بڑی بہو؟"

لچھمی اٹھ بیٹھی بولی "اچھی ہے۔"

شیو چرن نے کہا "سویرے کی بات معلوم ہوئی۔ بچو کو بلوا کر
سب کے سامنے ایسا جھاڑ دیا ہے کہ زندگی بھر نہ بھولیں گے۔
میں بیل پور کا شیو چرن چودھری ہوں۔ ہاں!"

ہری لچھمی ڈر گئی بولی "کیسے جی؟"

شیو چرن نے کہا "بپن کو بلا کر کہہ دیا۔ تمہاری بیوی میری

بیوی کے پاس آکر شان دکھا کر اس کی توہین کر گئی۔ اتنی جرأت اس کی! پاجی نالائق اوچھے گھر کی لڑکی کہیں کی! اس کے بال کٹوا کر منہ کالا کر کے گدھے پر چڑھا کر نکال باہر کر سکتا ہوں جانتا ہے؟"

ہری لچھمی کا مرض زدہ چہرہ ایک بارگی سفید پڑ گیا۔ وہ بولی تم کیا کہتے ہو جی!"

شیوچرن اپنے سینے کو ٹھونک کر فخر کے ساتھ کہنے لگا اس گاؤں میں جج سمجھو، مجسٹریٹ سمجھو۔ داروغہ یا پولیس جو کچھ بھی سمجھو یہی بندہ ہے یہی بندہ! مارنے کی لکڑی، جلانے کی لکڑی۔ سب کچھ میری مٹھی میں ہے۔ اگر تم کہو تو کل ہی وِپن کی بہو آکر تمہارے پیر نہ دبائے تو میں لالو چودھری کا بیٹا نہیں۔ . . . . . ."

اس طرح وپن کی بہو کو سب کے سامنے بے عزت اور رسوا کرنے کا تذکرہ اور اس کی تشریح میں لالو چودھری کے بیٹے نے فضول گوئی اور نامناسب الفاظ کے خرچ میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اس کے سامنے ساکن نظروں سے ٹکٹکی باندھے دیکھتی ہوئی ہری لچھمی کا دل کہنے لگا۔

"دھرتی ماتا پھٹ پڑو۔"

(۲)

دوسری بار کی نوجوان بیوی کی صحت کی حفاظت کیلئے شیوچرن صرف اپنی جان کے سوا اور سب کچھ دے سکتا تھا۔ مگر ہری لچھمی کی صحت بیل پور میں نہ سنبھل سکی۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ آب و ہوا تبدیل کرنی چاہیئے۔ شیوچرن نے اپنے ساڑھے پندرہ آنے کی

حیثیت کے مطابق بڑے ٹھاٹ باٹ سے آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے
جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یاترا کے شبھ مہورت (اچھی ساعت)
کے دن گاؤں کے لوگ ٹوٹ پڑے۔ صرف آیا نہیں تو ایک دین اور
اس کی بیوی۔ باہر شیو چرن ناگفتنی باتیں کہنے لگا اور اندر بڑی بُوا
نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ باہر بھی "ستھائی" میں آواز ملانے
والوں کی کمی نہ رہی اور اندر بھی، اسی طرح بُوا کی چیخ و پکار کو بڑھانے
والی عورتیں کافی جمع ہو گئیں۔ صرف کچھ نہیں بولی تو ہری لچھمی، منجھلی
بہو کے بارے میں اس کا غصہ اور ناراضگی بھی کسی سے کم نہ تھی وہ
دل ہی دل میں کہنے لگی "میرے جاہل شوہر نے چاہے کتنی ہی بے انصافی
کیوں نہ کی ہو میں نے خود تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن گھر اور باہر کی عورتیں جو
آج چلا رہی تھیں ان کے ساتھ کسی طرح آواز ملانے میں اسے نفرت معلوم
ہونے لگی۔ جاتے وقت پالکی کا دروازہ ہٹا کر لچھمی نے پر اشتیاق نظروں
سے دین کے ٹوٹے پھوٹے گھر کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ لیکن کسی کا سایہ
تک اُسے نہ دکھائی دیا

بنارس میں مکان ٹھیک کر لیا گیا تھا۔ وہاں کی آب و ہوا کے اثر سے
لچھمی کی زائل شدہ صحت کے حصول میں زیادہ دشواری نہ پیش آئی چار
مہینے بعد جب وہ لوٹ کر گھر آئی تو اس کے بدن کا انداز دیکھ کر عورتوں
کی اندرونی رشک و حسد کا ٹھکانا نہ رہا۔

جاڑے کا موسم آرہا تھا۔ دوپہر کو منجھلی بہو اپنے دائم المریض
شوہر کے لئے ایک ادنی گلوبند بن رہی تھی۔ پاس ہی لڑکا بیٹھا کھیل
رہا تھا۔ وہ دیکھ کر چلا اٹھا "ماں تائی جی"۔

ماں نے ہاتھ کا کام جہاں تہاں چھوڑ کر فوراً اٹھ کر نمسکار کیا اور بیٹھنے کے لئے آسن بچھا دیا۔ پھر کھلے ہوئے چہرے سے کہا "طبیعت ٹھیک ہو گئی بیجی۔"

لچھمی نے کہا "ہاں ہو گئی۔ مگر ٹھیک نہیں بھی تو ہو سکتی تھی۔ ایسا بھی تو ہو سکتا تھا۔ کہ پھر کبھی لوٹ کر نہ آتی۔ اس کے باوجود جاتے وقت تم نے ذرا بھی کھوج خبر نہیں لی۔ راستے بھر تمہاری کھڑکی کی طرف دیکھتی ہوئی گئی۔ ذرا سا ایک بار سایہ تک نہیں دکھائی دیا مریض جیسی چلی جا رہی ہے۔ ذرا محبت بھی نہ لگی۔ منجھلی بہو! ایسی پتھر کی بنی ہو تم!"

منجھلی بہو کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں مگر منہ سے کوئی جواب نہ نکلا منجھلی بہو نے اس الزام کا بھی کوئی جواب نہیں دیا وہ خاموش کھڑی رہی۔"

لچھمی اس کے پہلے یہاں اور کبھی نہیں آئی تھی۔ آج ہی پہلے پہل اس نے اس گھر میں قدم رکھا تھا۔ وہ ادھر ادھر گھوم پھر کر تمام کوٹھڑیاں دیکھنے لگی۔ سو سال کا پرانا ٹوٹا پھوٹا مکان تھا۔ اس میں صرف تین کوٹھڑیاں کسی قدر رہنے کے لائق تھیں۔ مفلسی کا ڈیرہ تھا۔ اسباب تو نہیں کے برابر تھا۔ دیواروں کا چونا چھٹتا جا رہا تھا۔ مرمت کرانے کی طاقت نہیں تھی۔ پھر بھی غیر ضروری گندگی کہیں نام کو نظر نہیں آتی تھی۔ چھوٹے بچھونے تھے۔ لیکن صاف ستھرے۔ دو چار دیوی دیوتاؤں کی تصویریں ٹنگی تھیں اور منجھلی بہو کے اپنے ہاتھ کی فن کاری کے کچھ نمونے بھی تھے۔ زیادہ تر اون اور سوت کے کام کی

چیزیں تھیں۔ ان میں نہ تو کسی نو آموز کے ہاتھ کا سُرخ چونچ والا طوطا تھا۔ اور نہ پنجرے کی بلّی کی شکل۔ قیمتی فریم میں جڑے ہوئے لال نیلے بینگنی سفید وغیرہ رنگوں کے اُون سے بنے ہوئے "ویلکم" "خوش آمدید" یا غلط تلفظ کے گیتا کے شلوک بھی نہ تھے۔

لچھمی نے تعجب کے ساتھ پوچھا "یہ کس کی تصویر ہے۔ منجھی بہو! پہچانا ہوا سا چہرہ معلوم ہوتا ہے!"

منجھلی بہو نے شرماتے ہوئے ہنس کر کہا۔ تلک مہاراج کی تصویر دیکھ دیکھ کر بُننے کی کوشش کی تھی۔ جیجی مگر کچھ بنی نہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے انگلی اٹھا کر سامنے کی دیوار پر ٹنگے ہوئے ہندوستان کے رتن لوکمانیہ تلک کی تصویر دکھا دی۔

لچھمی بہت دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد آہستہ سے بولی "پہچان نہیں سکی۔ یہ میرا ہی قصور ہے منجھلی بہو۔ تمہارا نہیں مجھے سکھا دو گی بہن؟ یہ ہنر اگر سیکھ سکی تو تمہیں گورو ماننے میں مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

منجھلی بہو ہنسنے لگی۔ اس روز تین چار گھنٹے بعد جب لچھمی گھر آئی تو یہ بات طے کر گئی کہ وہ کشیدہ کاری سیکھنے کے لئے کل سے روز آیا کرے گی۔ آنے بھی لگی لیکن دس پندرہ روز میں وہ سمجھ گئی کہ وہ ہنر نہ صرف دشوار ہے بلکہ اس کے سیکھنے میں کافی زمانہ بھی لگے گا ایک روز لچھمی نے کہا "منجھلی بہو! تم مجھے خوب جی لگا کر نہیں سکھاتی ہو؟" منجھلی بہو نے کہا۔ اس میں تو کافی وقت لگے گا جیجی۔ اس سے اچھا ہے کہ آپ اور دوسری بنا دئیں سیکھیں۔"

لچھمی اندر ہی اندر غصہ ہو گئی لیکن اسے چھپاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ تمہیں سیکھنے میں کتنے دن لگے تھے منجھلی بہو؟"

منجھلی بہو نے جواب دیا۔ "مجھے تو کسی نے سکھایا نہیں جیجی۔ اپنی کوشش ہی سے تھوڑا تھوڑا کر کے . . . ."

لچھمی نے کہا۔ اسی سے۔ نہیں تو دوسرے سے سیکھیں۔ تو تم بھی وقت کا حساب رکھتیں۔"

زبان سے چاہے وہ کچھ بھی کہے۔ لیکن دل ہی دل میں اس نے بغیر کسی شبہ کے محسوس کیا کہ عقل و ذہانت میں وہ بہو کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

آج اس کے سیکھنے کا کام آگے نہ بڑھ سکا اور وقت سے بہت پہلے ہی وہ سوئی دھاگا اور پیٹرن لپیٹ کر گھر چل دی۔ دوسرے روز نہیں آئی۔ اور روز کے آنے میں یہ پہلی بار ناغہ ہوا

تین چار روز کے بعد پھر ایک روز لچھمی اپنا سوئی دھاگے کا بکس لے کر منجھلی بہو کے گھر پہنچی۔ منجھلی بہو اس وقت اپنے لڑکے کو رامائن سے تصویریں دکھا دکھا کر اس کی کتھا سنا رہی تھی لچھمی کو دیکھتے ہی اس نے اٹھ کر آسن بچھا دیا اور مضطرب لہجے میں پوچھنے لگی۔ "دو تین دن یہاں آئی نہیں۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی کیا؟"

لچھمی نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ نہیں تو یونہی پانچ چھ روز نہ آسکی۔"

منجھلی بہو نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ پانچ چھ دن نہیں آئیں؟ شائد اتنے دن ہو گئے ہوں۔ لیکن آج دو گھنٹے زیادہ رکھ کر سارے ناغوں کی کسر نکال لینا چاہتی ہوں۔"

لچھمی نے کہا" ہوں۔ لیکن مان لو۔ میری طبیعت ہی خراب ہوتی ہوتی۔ منجھلی بہو۔ تمہیں ایک بار خبر تو لے لینی چاہیئے تھی!"

منجھلی بہو نے شرماتے ہوئے کہا۔ ضرور لینی چاہیئے تھی۔ لیکن گھر گرہستی کے بہت طرح کے کام دھندے ہیں۔ اکیلی ٹھیری۔ کیسے بھیجتی بتائیے لیکن یہ میں مانتی ہوں جیجی مجھ سے قصور ہوا۔"

لچھمی دل ہی دل میں خوش ہوئی۔ پچھلے کئی روز وہ نہایت ناراضگی اور غرور کے باعث نہیں آئی تھی اور ساتھ ہی" جاؤں گی جاؤنگی" کر کے اس نے دن گذارے ہیں۔ اس منجھلی بہو کے سوا نہ صرف گھر میں بلکہ گاؤں بھر میں ایسا کوئی نہیں ہے۔ جس کے ساتھ وہ جی کھول کر ربط و ضبط رکھ سکے۔

لڑکا اپنے جی سے تصویریں دیکھ رہا تھا۔ ہری لچھمی نے اسے بلا کر کہا" ننکھل! یہاں میرے پاس آ بیٹا۔"

اس کے قریب آنے پر لچھمی نے اپنا بکس کھول کر ایک سونے کی زنجیر نکال کر اس کے گلے میں پہنا دی اور کہا" جاؤ۔ کھیلو جا کر۔" ماں کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے پوچھا" کیا آپ نے زنجیر اسے دے دی؟"

لچھمی نے بشاش چہرے سے جواب دیا" اور نہیں تو کیا؟"

منجھلی بہو نے کہا۔ آپ کے دینے ہی سے کیا۔ وہ لے لیگا؟"

لچھمی شرمندہ ہو گئی۔ بولی" کیا تائی ایک زنجیر بھی نہیں دے سکتی؟"

منجھلی بہو نے کہا" یہ تو میں نہیں جانتی۔ لیکن اتنا ضرور جانتی

ہوں کہ ماں ہو کر میں نہیں لینے دے سکتی۔ ننکھی اسے اتار کر اپنی تائی جی کو دیدو۔ ہم لوگ غریب ہیں مگر بھکاری نہیں۔ یہ بات نہیں کہ کوئی ایک قیمتی چیز اچانک ملے تو دونوں ہاتھ پھیلا کر دوڑیں۔"

لچھمی متعجب سی بیٹھی رہی۔ آج بھی اس کا دل کہنے لگا۔ "زمین پھوٹ پڑے"۔

جاتے وقت اس نے کہا۔ "لیکن یہ بات تمہارے جیٹھ جی کے کانوں تک پہنچے گی۔ منجھلی بہو۔"

منجھلی بہو نے کہا۔ ان کی بہت سی باتیں میرے کانوں تک آتی ہیں۔ میری ایک بات ان کے کانوں تک پہنچ جائے گی تو ان کے کان ناپاک نہیں ہو جائیں گے۔

لچھمی نے کہا۔ اچھی بات ہے۔ آزما دیکھنے ہی سے معلوم ہو جائیگا پھر ذرا ٹھہر کر بولی۔ "خواہ مخواہ توہین کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ منجھلی بہو۔ میں بھی سزا دینا جانتی ہوں۔"

منجھلی بہو نے کہا۔ یہ آپ کے ناراض ہونے کی بات نہیں میں نے آپ کی کوئی توہین نہیں کی۔ بلکہ میں نے صرف آپ کو اپنے شوہر کی توہین نہیں کرنے دی۔ اتنا سمجھنے کی تعلیم آپ کو ملی ہے!"

لچھمی نے کہا۔ وہ ملی ہے نہیں ملی ہے تو صرف تم جیسی گاؤں دیہات کی عورتوں سے جھگڑنے کی تعلیم۔

منجھلی بہو نے اس کٹھ حجتی کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپ سادھے رہی

لچھمی نے چلنے کے لئے تیار ہو کر کہا۔ "اس زنجیر کی قیمت خواہ

کتنی ہی ہو۔ میں نے لڑکے کو پیار ہی سے دی تھی۔ تمہارے شوہر کی تکلیف دور کرنے کے خیال سے قطعی نہیں دی تھی، منجھلی بہو! بس تم نے اتنا ہی سیکھ رکھا ہے کہ بڑے آدمی صرف غریبوں کی توہین کرتے پھرتے ہیں۔ وہ پیار بھی کر سکتے ہیں۔ یہ تم نے نہیں سیکھا۔ سیکھنا ضروری ہے... مگر پھر جا کر ہاتھ پر نہ چھوتی پھرنا

اس کے جواب میں منجھلی بہو نے صرف ذرا مسکرا کر کہا۔ "نہیں جیجی۔ تم اس سے نہ ڈرو۔"

X X X X

(۲۳)

سیلاب کے دباؤ سے مٹی کا بند ٹوٹنا شروع ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی معمولی سی شروعات دیکھ کر تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مسلسل چلنے والی دھارا اتنے کم وقت کے اندر اس شکستگی کو اس قدر خوفناک اور ایسا عظیم بنا دے گی۔ ٹھیک یہی بات ہری لچھمی کے بارے میں بھی ہوئی۔ شوہر سے جب اس نے وپن اور اس کی بیوی کے خلاف الزام کی باتیں کہیں تو اس کے نتیجہ کا خیال کر کے وہ خود ڈر گئی۔ جھوٹ کہنے کی اس کی عادت نہ تھی اور کہنا بھی چاہتی۔ تو اس کی تعلیم اور حیثیت اس میں حارج ہوتی تھی۔ لیکن اس بات کو وہ خود بھی نہیں سمجھ سکی کہ پانی کے نہ رکنے والے دھارے کی طرح جو باتیں جھونک میں کے منہ سے زبردستی نکل گئیں ان میں سے بہت سی سچی نہیں تھیں۔

لیکن اس بات کا سمجھنا بھی اسے باقی نہ رہا کہ اس کی رفتار

کورو گنا اس کے جوتے کی باہر کی بات تھی۔ صرف ایک چیز کے بارے میں وہ ٹھیک طور پر نہیں جانتی تھی۔ یعنی اپنے شوہر کے مزاج سے وہ بخوبی واقف نہ تھی۔ اس کے شوہر کی طبیعت جس قدر بے رحم واقع ہوئی تھی۔ اسی قدر اس میں انتقام پسندی اور بربریت بھی تھی گویا وہ اس بات کو جانتا ہی نہیں کہ کسی کو تکلیف دینے کی بھی حد ہوتی ہے"

آج شیو چرن نے قلابازیاں نہیں کھائیں۔ سب کچھ سن سنا کر صرف اتنا کہا" اچھا پانچ چھ مہینے بعد دیکھنا۔ یہ ٹھیک سمجھ لینا۔ دوسرا سال نہ آنے پائے گا"

اہانت اور الہام کی آگ ہری لچھمی کے دل میں بھڑک رہی تھی۔ وہ واقعی اس بات کو چاہتی تھی کہ وپن کی بیوی کو خوب اچھی طرح سزا ملے۔ لیکن شیو چرن کے باہر چلے جانے پر اس کے منہ کی اس معمولی سی بات کو دل ہی دل میں دہراتے سے ہری لچھمی کے جی کو تسکین نہیں ہوتی اسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے کہیں کوئی بڑی بھاری خرابی ہوگئی ہے

کچھ روز بعد کسی بات چیت کے سلسلے میں ہری لچھمی نے شوہر سے مسکراتے ہوئے پوچھا" ان لوگوں کے بارے میں کچھ کیا دھرا ہے کیا؟"

"کن لوگوں کے بارے میں؟"

"وپن لالہ جی کے بارے میں؟"

شیو چرن نے افسردہ لہجے میں کہا" کیا کرتا اور کر بھی کیا سکتا ہوں میں معمولی آدمی جو ٹھیرا!"

ہری لچھمی نے پریشان ہوکر پوچھا۔" اس کے معنی؟"

شیو چرن نے کہا۔" منجھلی بہو کہا کرتی ہے نا۔ کہ حکومت تو جیٹھ جی کی نہیں ہے۔ انگریز سرکار کی ہے"۔!

ہری لچھمی نے کہا۔ ایسا کہا ہے کیا؟ لیکن اچھا۔۔۔"

اچھا کیا؟

بیوی کچھ شبہ ظاہر کرتے ہوئے بولی۔" لیکن منجھلی بہو تو اس قسم کی باتیں صاف صاف نہیں کہتی۔ وہ بہت چالاک ہے۔ بہت سے لوگ باتوں کو بڑھا چڑھا کر بھی تو کہا کرتے ہیں"۔

شیو چرن نے کہا۔" اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ بات تو میں نے اپنے کانوں سے سنی ہے"۔

ہری لچھمی اس بات پر یقین نہ کر سکی لیکن اس وقت شوہر کی دلبستگی کرنے کے خیال سے یکایک برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ کیا کہتے ہو اتنا گھمنڈ۔ مجھے تو خیر جو کچھ کہا۔ لیکن تم جیٹھ ہوتے ہو تمہاری تو ذرا عزت کرنی چاہیئے تھی؟"

شیو چرن نے کہا۔" ہندوؤں کے گھر تو ایسا ہی سب سمجھتے ہیں پڑھی لکھی لائق عورت ٹھہری نہ؟ اسی لئے۔ لیکن میری توہین کرکے کوئی بچ نہیں سکتا۔ باہر ذرا کام ہے۔ میں جا رہا ہوں"۔ یہ کہہ کر شیو چرن باہر چل دیا۔ بات کو جس طرح ہری لچھمی کہنا چاہتی تھی۔ اس طرح نہ کہہ سکی۔ بلکہ وہ الٹی ہو گئی۔ شوہر کے چلے جانے پر رہ رہ کر اسے اسی بات کا خیال ہونے لگا۔

باہر کی بیٹھک میں جا کر شیو چرن نے دین کو بلا کر کہا۔" پانچ سات

سال سے تم سے کہہ رہا ہوں۔ وین کہ اپنے مویشیوں کو یہاں سے ہٹا لو۔ رات کا سونا میرے لئے حرام ہو گیا ہے؟ تو کیا تم نے میری بات نہ سُننا ہی طے کر لیا ہے؟"

وین نے متعجب ہو کر کہا "کہاں! کم سے کم دس بار تو میں نے خود تم سے کہا ہے۔ تمہیں یاد نہ رہے تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن جو اتنی بڑی زمینداری پر حکومت کرتا ہے۔ اس کی بات بھول جانے سے کام نہیں چل سکتا۔ خیر کچھ بھی ہو تمہیں اس بات کی عقل ہونی چاہیئے تھی کہ دوسرے کی جگہ میں کیسے اتنے دنوں تک مویشی باندھے جا سکتے ہیں۔ کل ہی وہاں سے سب ہٹا ڈالینا۔ مجھے فرصت نہ ملے گی یہ تمہیں آخری بار میں نے جتا دیا۔

وین کے منہ سے یونہی بات نہیں نکلتی۔ اس پر اچانک اس تعجب خیز تجویز کے سامنے وہ یکبارگی مبہوت ہو گیا۔ اپنے بابا کے زمانے سے وہ اس جگہ کو اپنی ہی سمجھتا آ رہا ہے۔ اتنی بڑی جھوٹی بات کی وہ مخالفت نہ کر سکا کہ وہ دوسرے کی ہے۔ چپ چاپ گھر چلا آیا"

اس کی بیوی نے تمام باتیں سن کر کہا "لیکن حکومت کی عدالت تو کھلی ہے"

وین چُپ رہا۔ وہ چاہے جتنا بھولا آدمی کیوں نہ ہو۔ مگر اس بات کو جانتا تھا کہ انگریزی سرکار کی عدالت کا عظیم الشان دروازہ خواہ کتنا ہی کھلا ہو۔ غریبوں کے گھسنے کے لئے وہ ذرا سا بھی کھلا نہیں آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ دوسرے روز بڑے بابو کے لوگ آئے۔

اور انہوں نے پرانی ٹوٹی پھوٹی گوشالہ کو توڑ کر اس جگہ کو لمبی دیوار سے گھیر دیا۔ وین بھانے میں جا کر خبر دے آیا مگر تعجب کہ شیو چرن کی پرانی اینٹوں کی نئی دیوار جب تک پوری نہیں بن گئی۔ تب تک ایک بھی لال پگڑی اس کے پاس نہیں پھٹکی۔ وین کی بیوی نے ہاتھ کی چوڑیاں بیچ کر عدالت میں نالش کی۔ لیکن اس سے صرف چوڑیاں ہی چلی گئیں ہوا کچھ نہیں۔"

رشتے میں وین کی بُوا لگنے والی ایک بہی خواہ نے اس مصیبت میں وین کی بیوی کو ہری لچھمی کے پاس جانے کی صلاح دی تھی اس پر اس نے شائد کہہ دیا تھا کہ شیر کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہونے سے کیا فائدہ بُوا جی!

جان تو جانے والی ہے۔ جائے گی ہی۔ اُوپر سے توہین بھی برداشت کرنی پڑے گی۔"

جب یہ بات ہری لچھمی کے کانوں میں پڑی تو وہ چپ رہی اس نے کسی طرح کا جواب دینے کی کوشش تک نہیں کی۔

بنارس سے آب و ہوا تبدیل کر آنے کے بعد اسے پھر بخار آنے لگا۔ کچھ روز تک گاؤں ہی میں علاج ہوتا رہا۔ مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تب ڈاکٹر کے مشورے سے اسے پھر باہر جانے کی تیاریاں کرنی پڑیں۔"

مختلف قسم کے کام کاج کے باعث اب کی بار شیو چرن ساتھ نہ جا سکا۔ وہ گاؤں ہی میں رہا۔ جاتے وقت لچھمی اپنے شوہر سے ایک بات کہنے کے لئے اندر ہی اندر پھڑ پھڑاتی رہی۔ لیکن کسی طرح

زبان کھول کر اس آدمی کے سامنے وہ بات کہہ نہ سکی اسے بار بار ایسا معلوم ہونے لگا کہ ان سے سفارش کرنا فضول ہے۔ یہ اس کے معنی نہیں سمجھ سکتے۔

x x x x

(۴)

ہری لچھمی کو صحت یاب ہونے میں اس بار کچھ زیادہ دن لگ گئے۔ تقریباً ایک سال کے بعد وہ بیل پور واپس آئی۔ وہ صرف زمیندار کی لاڈلی بیوی ہی تو نہیں۔ اتنے بڑے گھر کی مالکن بھی تو ہے اس لئے محلے کی عورتیں جھنڈ کی جھنڈ اسے دیکھنے آئیں۔ جو رشتے میں بڑی تھیں ان لوگوں نے آشیرباد دیا اور جو چھوٹی تھیں انہوں نے پاؤں چھوئے۔ اگر آئی نہیں تو وین کی بیوی۔ ہری لچھمی بھی اس بات کو جانتی تھی کہ وہ نہیں آئے گی۔ اس ایک سال کے اندر وین کے گھر کے لوگ کس طرح رہے۔ فوجداری اور دیوانی معاملے جو اُن کے خلاف چل رہے تھے۔ ان کا کیا نتیجہ ہوا۔ ان میں سے کوئی بھی خبر اس نے کسی سے جاننے کی کوشش نہیں کی۔ شیو چرن کبھی گھر اور کبھی پچھم میں جاکر بیوی کے ساتھ گذار آیا کرتا تھا۔ جب شوہر سے ملاقات ہوئی ہے۔ تبھی ہری لچھمی کے دل میں سب سے پہلے ان لوگوں کے متعلق جاننے کی خواہش ہوئی ہے۔ پھر بھی ایک روز بھی اس نے شوہر سے ایک بات نہ پوچھی۔ اسے پوچھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ سوچتی۔ اتنے دنوں میں شائد کچھ نہ کچھ فیصلہ ہو گیا ہو گا اور شائد ان کے غصہ میں اب تیزی نہ باقی ہو، اس اندیشہ سے

کہ پوچھ تاچھ کرنے سے پھر کہیں پہلے کا زخم تازہ نہ ہو جائے وہ ویسا انداز بنائے رہتی۔ جیسے یہ سب معمولی باتیں اب اسے یاد نہیں ادھر شبھو چرن بھی اپنی طرف سے کسی دن وہ بن کی بات نہیں چھیڑتا اس بات کو وہ سری لچھمی سے چھپائے ہی رکھتا کہ اپنی بیوی کی توہین کی بات وہ بھولا نہیں ہے۔ بلکہ اس کی غیر موجودگی میں اس کا کافی انتقام اس سے لئے کر رکھا ہے۔ اس کی آرزو تھی کہ لچھمی گھر جا کر اپنی آنکھوں ہی سب کچھ دیکھ لے اور خوشی سے پھولی نہ سمائے۔"

زیادہ دن چڑھنے کے پہلے ہی بُوا جی کی بار بار کے محبت آمیز تقاضے سے لچھمی جب نہا دھو کر مطمئن ہوئی تو بُوا جی نے بیقراری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تمہاری طبیعت کمزور ٹھہری بہو رانی تم اب نیچے نہ جاؤ۔ یہیں تمہارے لئے تھالی منگوائے دیتی ہوں۔"

لچھمی نے تردید کرتے ہوئے ہنس کر کہا۔ میری طبیعت پہلے ہی جیسی ٹھیک ہو گئی ہے بُوا جی۔ میں نیچے رسوئی میں جا کر کھا آؤں گی اوپر لانے کی ضرورت نہیں۔ چلو نیچے ہی چلتی ہوں۔"

بُوا جی نے "شبھو کی طرف سے منائی ہے۔" کہتے ہوئے اسے روک دیا۔ ان کا حکم پا کر نوکرانی جگہ صاف کر کے آسن بچھا گئی دوسرے ہی لمحہ مصرانی کھانا لے کر حاضر ہوئی۔ اس کے تھالی رکھ کر چلے جانے پر لچھمی نے آسن پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ مصرانی جی کون سی ہیں بُوا جی؟ پہلے تو کبھی نہیں دیکھا انہیں۔"

بُوا جی نے ہنس کر کہا۔ پہچان نہ سکیں بہو رانی۔ یہ تو اپنے وہ بن کی بہو ہے۔

لچھمی ساکت ہو کر بیٹھی رہ گئی۔ دل ہی دل میں سمجھ گئی۔ اسے یکایک غرقِ حیرت کر دینے کے لئے ہی اتنی سازش کر کے اس طرح چھپا رکھا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد اپنے کو سنبھال کر وہ مستفسرانہ نظروں سے بُوا جی کی طرف دیکھنے لگی۔

بُوا جی نے کہا "وپن مر گیا ہے۔ سن لیا ہو گا"

لچھمی نے کچھ بھی نہیں سنا تھا۔ لیکن ابھی ابھی جو عورت اسے کھالی دے گئی تھی۔ اس کی طرف دیکھنے ہی سے یہ بات معلوم ہو جاتی تھی کہ وہ بیوہ تھی۔ اس نے سر ہلا کر کہہ دیا "ہاں"

بُوا جی نے باقی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا "جو کچھ بچا کھچا تھا خاک دُھول وہ سب مقدمہ بازی میں جلا کر وپن تو مر گیا۔ جب دیکھا کہ باقی روپیہ چکانے میں مکان بھی ہاتھ سے جاتا ہے تو ہمیں لوگوں نے مشورہ دیا کہ منجھلی بہو سال دو سال اپنے جسم سے محنت کر کے روپے چکا دے تاکہ تیرے لڑکے کے لئے کم سے کم بیٹھنے کو ایک جگہ تو بچی رہے۔

لچھمی اپنے فق اور سفید چہرے سے اس طرح آنکھیں پھاڑے چپ چاپ دیکھتی رہ گئی۔ بُوا جی نے اچانک اپنی آواز کو مدھم کر کے کہا "پھر بھی میں نے ایک بار اسے الگ لے جا کر کہا تھا کہ منجھلی بہو جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب قرض ادھار کر کے جیسے ہو سکے ایک بار کاشی جا کر بڑی بہو کے پیروں پڑ آ۔ لڑکے کو ان کے پیروں پر ڈال کر کہنا "جیجی! اس کا تو کوئی قصور نہیں اسے بچاؤ"

بات کرتے کرتے بُوا جی آنکھوں کے آنسو پونچھتی ہوئی بولیں مگر

بندی سر نیچا کئے منہ پر تالا لگائے بیٹھی رہی۔ اس نے ہاں نہیں کچھ جواب ہی نہیں دیا۔"

ہری لچھمی سمجھ گئی۔ اس کا سارے کا سارا الزام میرے ہی سر پر آپڑا ہے۔ اس کے منہ کا لقمہ سب کا سب تلخ اور زہر ہو گیا۔ وہ ایک لقمہ بھی نہ کھا سکی۔ بوا جی کسی کام سے تھوڑی دیر کے لئے کمرے سے باہر چلی گئیں تھیں۔ لوٹ کر جب انہوں نے لچھمی کی تھالی دیکھی تو وہ بیقرار ہو گئیں۔ زور سے پکارنے لگیں "وِپن کی بہو! وِپن کی بہو!"

وِپن کی بہو کے دروازے کے باہر آکر کھڑے ہوتے ہی وہ زور سے بگڑ پڑیں۔ اس کے چند ہی منٹ پہلے غم کے سبب ان کی آنکھوں میں جو آنسو بھر آئے تھے۔ وہ فوراً ہی نہ جانے کہاں اڑ گئے۔ وہ تیز لہجہ میں کہنے لگیں "ایسی بے پروائی سے کام کرنے سے تو نہیں نبھ سکتا وِپن کی بہو۔ بہو رانی ایک دانہ بھی زبان پر نہ رکھ سکیں۔ ایسا بُرا کھانا پکایا ہے۔

دروازے کے باہر سے اس ڈانٹ کا کوئی جواب نہیں آیا۔ لیکن دوسرے کی توہین کے بارے شرم اور رنج کے مارے ہری لچھمی کا سر اپنے کمرے کے اندر جھک گیا۔

بوا جی نے پھر کہا "نوکری کرنے چلی ہو تو چیز بگاڑنے سے کام نہ چلے گا بیٹی۔ جس طرح اور سب نوکرانیاں کام کرتی ہیں۔ تمہیں بھی اسی طرح کرنا چاہیئے میں کہے دیتی ہوں۔"

وِپن کی بیوی نے اب کی بار آہستہ سے کہا "جی جان سے کوشش تو ایسی ہی کرتی ہوں بوا جی۔ آج معلوم نہیں کیسے کیا ہو گیا!"

یہ کہہ کر اس کے نیچے چلے جانے کے بعد لچھمی کے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہی بُوا جی "ہائے ہائے" کر اٹھیں۔ لچھمی نے نرمی کے ساتھ کہا "کیا افسوس کر رہی ہو بُوا جی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ اسی لئے نہیں کھا سکی منجھلی بہو کی رسوئی میں کوئی خرابی نہیں تھی۔"

ہاتھ منہ دھو کر ہری لچھمی اپنے سنسان کمرے میں گئی تو اس کا دم گھٹنے سا لگا۔ ہر طرح کی توہین برداشت کرتے ہوئے بھی وپن کی بیوی کا شاید اس گھر میں نوکری کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن آج کے بعد گھر کی مالکہ کے فرائض کی انجام دہی کی بے نتیجہ کوشش کر کے اس کا خود اس گھر میں کیسے گذارہ ہو سکتا ہے؟ منجھلی بہو کے لئے تو پھر بھی ایک تسکین کی صورت ہے بغیر قصور کے مصیبت برداشت کرنے کی تسکین۔ لیکن خود لچھمی کے لئے کہاں کیا باقی رہ گیا۔

رات کو لچھمی شوہر کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی۔ مگر آج اسے اچھی طرح اس کی طرف دیکھا بھی نہیں گیا۔ آج اس کی زبان کے ایک لفظ سے وپن کی بیوی کا تمام دکھ دور ہو سکتا تھا۔ لیکن مجبور کمزور عورت سے جو آدمی اتنا زبردست انتقام لے سکتا ہے۔ جس کی مردانگی میں یہ بات کھٹکتی تک نہیں۔ اس سے بھیک مانگنے کی تو ذلالت گوارا کرنے میں لچھمی کو کسی قدر ترغیب نہیں ہوئی۔ شیو چرن نے ذرا ہنس کر پوچھا "منجھلی بہو سے ملاقات ہوئی؟ کہو کیسا کھانا پکاتی ہے؟"

ہری لچھمی جواب نہ دے سکی۔ وہ سوچنے لگی "یہی آدمی اس کا شوہر ہے؟ اور زندگی بھر اسے اسی کے ساتھ رہ کر گھر گرہستی سنبھالنی ہوگی یہ سوچتے ہی اس کا دل کہنے لگا "زمین پھٹ پڑتی!"

دوسرے روز صبح اٹھتے ہی لچھمی نے داسی کے ذریعہ بُواجی کو کہلا بھیجا۔ اسے بخار آگیا ہے۔ وہ کچھ نہ کھائے گی"۔

بُواجی نے اس کے کمرے میں آکر جرح کرتے کرتے ناک میں دم کر دیا۔ اس کے چہرے کے انداز سے اور آواز سے انہیں نہ جانے کیسا شُبہ سا ہو گیا۔ ان کی بہورانی شائید کچھ چھُپانے کی کوشش کر رہی ہے بولیں "لیکن تمہیں تو سچ مچ بخار نہیں آیا ہے بہورانی؟"

لچھمی نے سر ہلا کر زور سے کہا "مجھے بخار ہے۔ میں کچھ نہ کھاؤنگی"۔

ڈاکٹر کے آنے پر اسے باہر ہی سے رخصت کرتے ہوئے لچھمی نے کہا "آپ تو جانتے ہیں آپ کی دوا سے مجھے کچھ فائدہ نہیں ہوتا؟ آپ جا ہیئے"۔

شیو چرن نے آکر بہت کچھ پوچھ گچھ کی۔ لیکن کسی بات کا اسے جواب نہ ملا۔

دو تین روز اور جب اسی طرح گذر گئے تو گھر کے سبھی لوگ۔ نہ جانے کیسے ایک لامعلوم اندیشے سے بے چین ہو گئے۔

اس روز دن کے قریب تیسرے پہر لچھمی غسل خانے سے نکل کر چپ چاپ دبے پاؤں آنگن کے ایک کنارے سے اوپر جا رہی تھی بُواجی رسوئی گھر کے برآمدے سے اسے دیکھ کر چلّا اٹھیں "دیکھو بہورانی۔ دیکھو ون کی بہو کی کرتوت دیکھو" ایں! منجھلی بہو آخر ہیں چوری کرنے پر اتر آئی؟"

ہری لچھمی پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ منجھلی بہو چپ چاپ زمین پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ایک برتن میں کچھ کھانا انگوچھے سے ڈھکا رکھا تھا بُواجی نے اسے دکھاتے ہوئے کہا "تمہیں بتاؤ۔ بہورانی۔ اتنا بھات

اور ترکاری ایک آدمی کھا سکتا ہے؟ گھر لئے جارہی ہے۔ لڑکے کے لئے!
جب کہ بار بار اسے منع کردیا گیا ہے، شیوچرن کے کان میں بھنک پڑنے
پر پھر خیر نہیں، گردن پکڑ کر نکال باہر کرے گا۔ بہو رانی تم مالکن ہو تم ہیں
اس کا فیصلہ کردو۔ یہ کہہ کر بوا جی نے گویا اپنا ایک فرض ادا کر کے اطمینان
کا سانس لیا۔

بوا جی کی آواز سن کر گھر کے نوکر نوکرانی اور لوگ بھی جو جہاں تھے سب
آکر اکٹھا ہو گئے۔ اور لگے تماشہ دیکھنے ان سب کے درمیان میں بیٹھی تھی
اس گھر کی منجھلی بہو اور اس کی مالکن یعنی اس گھر کی گرہستن!

لچھمی کو اس بات کا خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ اتنی چھوٹی اتنی معمولی
چیز کے بارے میں اتنا بڑا بھدا معاملہ ہو سکتا ہے الزام کا جواب تو کیا
دیتی مارے توہین کے، شرم اور غصہ کے وہ سر بھی نہ اٹھا سکی۔ شرم اور
کسی کے لئے نہیں خود اپنے ہی لئے تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے
لگے۔ اسے معلوم ہونے لگا۔ اتنے لوگوں کے سامنے گویا وہی پکڑی گئی ہو۔
اور وہن کی بہو اس کا فیصلہ کرنے بیٹھی ہو۔

دو تین منٹ تک اسی طرح رہ کر ایکا یک زوردار کوشش سے اپنے
کو سنبھال کر لچھمی نے کہا: "بوا جی تم سب لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔"

اس کا اشارہ پاتے ہی جب سب چلے گئے تو لچھمی آہستہ سے منجھلی بہو
کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ پھر ہاتھ سے اس کا منہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کی دونوں
آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ لچھمی بولی: "منجھلی بہو! میں
تمہاری جیجی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے آنچل سے اس کے آنسو پونچھ دئے

ابھاگنی کا سوہاگ

ٹھاکر داس مکرجی کی بڑی بوڑھی بیوی کا سات روز بخار آنے کے بعد انتقال ہو گیا۔ بوڑھے مکرجی مہاشے نے دھان کے کاروبار میں کافی دولت کمائی تھی۔ ان کے چار لڑکے اور تین لڑکیاں اور ان سب کے بھی بال بچے موجود تھے۔ ان کے علاوہ داماد پاس پڑوسی اور نوکر چاکر سب کے اکٹھا ہو جانے سے ایک تقریب سی بن گئی تھی۔ گاؤں بھر کے لوگ دھوم دھام کے ساتھ نکلنے والی ارتھی دیکھنے آئے لڑکیوں نے رو رو کر ماں کے دونوں پاؤں میں گاڑھا مہاور اور بہوؤں نے پیشانی پر صندل لگا کر ساس کی لاش کو قیمتی کپڑوں سے ڈھک دیا اور آنچل سے ان کے قدموں کی آخری دھول لے کر اپنی پیشانی سے لگائی۔ پھول پتی خوشبو مالا کی بھرمار اور لوگوں کے شور و غل کے باعث پتہ ہی نہ چلتا تھا کہ اس گھر میں کوئی غمی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کسی بڑے گھر کی دولہن پچاس برس بعد پھر از سر نو اپنے شوہر کے گھر جانے کے لئے رخصت ہو رہی ہے۔

مکرجی مہاشے پُرسکون چہرے کے ساتھ اپنی رفیقۂ زندگی کو آخری بار رخصت کر کے چپکے چپکے آنکھوں کے آنسو خشک کرتے ہوئے غمزدہ بیٹیوں اور بہوؤں کو تسکین دینے لگے۔ ”ہری ہری کی زبردست پکار سے صبح کی فضا میں ہنگامہ سا برپا کرتا ہوا سارے کا سارا گاؤں

ارتھی کے ساتھ ہولیا۔ ان سب کے علاوہ ایک عورت ذرا فاصلے سے اس بھیڑ کے ساتھ ہولی۔ وہ تھی کنگالی کی ماں۔ وہ اپنے جھونپڑے کے آنگن میں پھلے ہوئے بیگنوں کو توڑ کر بازار میں بیچنے جارہی تھی لیکن اس منظر کو دیکھ کر اس کے قدم بازار کی طرف نہ اٹھ سکے۔ اس نے اپنا بازار جانا ملتوی کر دیا۔ اس کے آنچل میں بندھے ہوئے بیگن جیسے کے تیسے رہ گئے۔ وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی لوگوں کے پیچھے پیچھے شمشان میں جاموجود ہوئی۔ گاؤں کے باہر گرونٹر ندی کے کنارے شمشان ہے۔ وہاں پہلے ہی سے لکڑی کے بوجھ۔ صندل کے ٹکرے۔ گھی۔ شہد۔ دھوپ، رال وغیرہ سامان پہنچ چکا تھا۔ کنگالی کی ماں چھوٹی ذات کی تھی۔ دولے کی لڑکی ہونے کے باعث اسے قریب جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ دور ہی سے ایک اونچی ٹیکری پر کھڑی کھڑی آخری مراسم کو ابتدا سے انتہا تک پر اشتیاق نگاہوں سے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ لمبی چوڑی چتا پر لاش رکھی گئی تو اس کے مہاور سے رنگے ہوئے دونوں پیروں کو دیکھ کر کنگالی کی ماں کی دونوں آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس کا جی چاہا وہ دوڑ کر لاش کے پاس جائے اور پاؤں سے ایک قطرہ مہاور پونچھ کر اپنی پیشانی پر لگالے۔ لوگوں کی "ہری ہری" کی پکار کے ساتھ جب بیٹے کے ہاتھ کی منتر پڑھی ہوئی آگ سے چتا جلنے لگی۔ تو کنگالی کی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ دل ہی دل میں بار بار کہنے لگی۔ خوش قسمت ماں! تم سورگ کو جارہی ہو۔ مجھے آشیرباد دیتی جاؤ کہ اسی طرح میں بھی کنگالی کے ہاتھ کی آگ پاسکوں۔ بیٹے کے ہاتھ کی آگ شوہر، بیٹا، بیٹی۔ ناتی۔ نتنی۔ نوکر، نوکرانی، عزیز و اقارب سب کے

سامنے سورگ کو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ وہ خوش قسمتی کا اندازہ نہ کر سکی۔ تیزی سے جلتی ہوئی چتا کا مسلسل اٹھتا ہوا زور کا دھواں نیلے رنگ کا عکس بکھیرتا اور چکر کھاتا ہوا آسمان کی طرف اڑا جا رہا تھا جس میں کنگالی کی ماں کو گویا ایک چھوٹے سے رتھ کی شکل صاف دکھائی دی۔ اس رتھ کے ہر چہار جانب کتنی ہی تصویریں بنی ہوئی تھیں اور اس کی چوٹی پر طرح طرح کی بیلیں اور پتیاں لپٹی ہوئی تھیں اس کے اندر نہ جانے کون بیٹھا تھا۔ اس کی صورت پہچانی نہیں جاتی تھی لیکن اس کی پیشانی پر سیندور اور پاؤں میں مہاور لگا ہوا تھا۔ اس کی طرف دیکھتے دیکھتے کنگالی کی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار جاری ہو گئی۔ اسی حالت میں پندرہ چودہ سال کا ایک لڑکا اس کی آنچل کھینچتا ہوا بولا۔ تو یہاں کھڑی ہے۔ ماں روٹی نہیں پکائے گی؟"

ماں چونکی اور لڑکے کی طرف دیکھ کر کہا" بناؤں گی کیوں نہیں؟" اس کے بعد یکایک اوپر کی جانب انگلی اٹھا کر مضطربانہ لہجے میں کہا "دیکھ بیٹا برہمن ماں جی رتھ میں چڑھی سورگ کو جا رہی ہیں۔"

لڑکے نے تعجب کے ساتھ سر اٹھا کر کہا" کہاں؟"

کچھ دیر تک اچھی طرح غور سے دیکھنے کے بعد وہ پھر بولا" تو پاگل ہو گئی ہے ماں؟ وہ تو دھواں ہے۔ اس کے بعد اس نے بگڑ کر کہا "دوپہر ہو گئی۔ مجھے بھوک نہ لگی ہو گی کیا؟"

پھر ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر بولا۔ برہمنی ماں کے مرنے پر تو کیوں رو رو کر جان کھو رہی ہے ماں؟

کنگالی کی ماں کو اب خیال ہوا۔ دوسرے کے لئے شمشان میں کھڑی

ہوکر اس طرح آنسو بہانے پر اسے دل ہی دل میں شرم معلوم ہونے لگی اور اس خیال سے کہ اس کا اس طرح رونا بیٹے کے حق میں کسی بدشگونی کا باعث نہ ہو وہ دوسرے ہی لمحے آنکھیں خشک کر کے کسی قدر ہنسنے کی کوشش کرتی ہوئی بولی۔ روؤں گی کیوں رے۔ آنکھوں میں دھواں لگ گیا تھا۔ اسی سے آنسو نکل آئے تھے۔

"ہاں ہاں دھواں لگ گیا تھا۔ تو صاف ہی تو رو رہی تھی"۔

ماں نے پھر کچھ جواب نہیں دیا۔ لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر گھاٹ پر گئی لیکن خود بھی نہائی اور کنگالی کو بھی نہلایا۔ اس کے بعد گھر واپس چلی آئی شمشان میں رہ کر چتا جلانے کی رسم کو آخر تک دیکھنا۔ اس کی قسمت میں نہ تھا

(۲)

اولاد کے نام رکھنے کے معاملے میں ماں باپ کی بیوقوفی پر قدرت زیادہ ترغیب میں صرف ہنسنے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ سختی کے ساتھ اس کا جواب بھی دیتی ہے یہی وجہ ہے کہ اولاد کی ساری زندگی گویا مرتے دم تک اس کے نام پر طنز کرتی رہتی ہے۔ کنگالی کی ماں کی زندگی کو قدرت کے اس طعن کو طنز کی مصیبت سے چھٹکارا مل گیا تھا۔ اسے پیدا کرنے کے بعد ہی اس کی ماں مرگئی تھی۔ اسی لئے باپ نے غصے میں آکر اس کا نام ابھاگنی رکھ دیا۔ ماں موجود نہ تھی۔ اس لئے باپ ندی میں مچھلی کا شکار کرتا پھرتا تھا۔ اسے نہ دن کی پرواہ تھی۔ نہ رات کی پھر بھی نہ جانے کس طرح یہ ننھی سی ابھاگنی ایک روز کنگالی کی ماں بننے کیلئے زندہ بچ گئی۔ واقعی یہ ایک طرح کی تعجب کی بات ہے"۔

جس شخص کے ساتھ کنگالی کی شادی ہوئی اس کا نام رسک باگھ

ابھاگنی

(رنگیلا شیر) اس شیر کی ایک اور شیرنی تھی۔ جسے لے کر وہ دوسرے گاؤں چلا گیا اور ابھاگن اپنی بدقسمتی اور بچے کنگالی کو لے کر اسی گاؤں میں پڑی رہ گئی۔

اس کا وہ کنگالی اب بڑا ہو گیا ہے اور پندرھویں سال میں پہنچ چکا ہے۔ آج کل وہ بیت کا کام سیکھتا ہے۔ ابھاگن کو امید ہونے لگی ہے کہ اگر وہ ایک سال تک اور اپنی بدقسمتی سے جنگ آزمارہ سکی تو اس کا دکھ دور ہو جائے گا۔ اس کا یہ دکھ کیا ہے اور کیسا ہے اسے وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اسے دیکھتے ہیں۔

کنگالی تالاب سے ہاتھ منہ دھو کر آیا تو دیکھا اس کی ماں تھالی کا بچا ہوا کھانا برتن سے ڈھک کر رکھ رہی ہے۔ اس نے تعجب سے پوچھا "تو نے نہیں کھایا ماں؟"

"بہت دیر ہو چکی ہے بیٹا اب بھوک بھی نہیں رہی"

لڑکے کو یقین نہیں آیا بولا "ہاں ضرور بھوک نہ ہو گی۔ دیکھوں تو تیری ہانڈی"

اس طرح ماں اسے بہت دنوں سے دھوکا دیتی آ رہی تھی اس سے وہ آج ہانڈی دیکھے بغیر نہ رہا۔ اس میں ایک مٹھی چاول اور تھے۔ وہ خوش ہو کر ماں کی گود میں جا بیٹھا۔ اس عمر میں لڑکے عام طور پر اس طرح ماں کی گود میں نہیں بیٹھا کرتے۔ لیکن بچپن ہی سے بیمار رہنے کے باعث ماں کی گود کے سوا اسے دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ ماں کی گود ہی میں بیٹھ کر کھیل کود کا شوق پورا کیا کرتا تھا۔ ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اس کے منہ پر

اپنا منہ رکھتے ہی کنگالی چونک پڑا۔" ماں! تیرا بدن گرم ہے تو کیوں دھوئیں میں کھڑی ہو کر مردے کا جلنا دیکھ رہی تھی! اور پھر جا کے نہا کیوں لیا؟ کیا تو نے مردے جلنا . . . .

ماں نے جلدی سے لڑکے کا منہ بند کر کے کہا۔" چھی بیٹا مردہ جلتا نہیں کہتے۔ پاپ ہوتا ہے۔ ستی لچھمی ماں مہارانی رتھ میں چڑھ کر سورگ کو گئی ہیں۔"

لڑکے نے شک کرتے ہوئے کہا۔ تو بار بار وہی ایک بات کہتی ہے۔ بھلا کوئی رتھ پر چڑھ کر کہیں سورگ کو گیا ہے؟

ماں نے کہا" میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ بیٹا برہمنی ماں جی رتھ میں بیٹھی تھیں۔ ان کے لال لال پاؤں تو سبھی نے دیکھے ہیں۔"

" سبھی نے دیکھے ہیں؟"

" ہاں سبھی نے دیکھے ہیں۔"

کنگالی ماں کے سینے سے لگ کر سوچنے لگا۔ وہ ماں کی بات پر یقین کرنے کا خوگر تھا۔ اس نے بچپن ہی سے ماں کی بات کا یقین کرنا سیکھا تھا۔ پھر جب وہ کہہ رہی ہے کہ سب نے اپنی آنکھوں سے اس واقعہ کو دیکھا تو اب یقین نہ کرنے کی گنجائش ہی کہاں باقی رہی تھوڑی بعد اس نے آہستہ سے کہا۔" تب تو تو بھی سورگ کو جائے گی ماں۔ اس روز بندو کی ماں راکھال کی بوا سے کہہ رہی تھی۔ کنگالی کی ماں جیسی ستی لچھمی دو نو میں کوئی نہیں ہے۔"

کنگالی کی ماں خاموش تھی۔ کنگالی اسی طرح آہستہ آہستہ کہتا رہا

"منو کی ماں کہتی تھی۔ جب بابا نے تجھے چھوڑ دیا تو کتنے آدمیوں نے شادی کرنے کے لئے تجھ سے خوشامد کی لیکن تو نے کہا نہیں۔ میرا کنگالی جیتا رہے میری سب مصیبت دور ہو جائے گی میں دوسری شادی کیوں کروں۔ اچھا ماں اگر تو شادی کر لیتی تو میں کیا کرتا شائد بھوکوں مر جاتا۔" ماں نے دونوں ہاتھوں سے بیٹے کو سینے سے چپکا لیا۔ واقعی اس موقعہ پر کم لوگوں نے اسے یہ مشورہ نہیں دیا اور جب وہ اس کے لئے کسی طرح تیار نہ ہوئی تو اودھم مچانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ ان دنوں کی باتوں کو یاد کر کے ابھاگن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ لڑکے نے ہاتھ سے ماں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ گُدڑی بچھا دوں ماں سوئے گی؟"

ماں خاموش تھی۔ کنگالی نے چٹائی بچھائی۔ اس پر گُدڑی بچھا دی پیان کے اوپر سے چھوٹا تکیہ اٹھا لایا اور ماں کا ہاتھ پکڑ کر بستر پر سلانے لے چلا ماں نے کہا۔ "کنگالی! آج تو کام پر نہ جانا۔"

کنگالی کو ماں کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ مگر اس نے کہا۔ پھر ناشتے کے لئے دو پیسے نہ ملیں گے۔

"نہ ملیں گے نہ ملیں۔ آ میں تجھے کہانی سناؤں۔"

ماں کو زیادہ ترغیب نہیں دینی پڑی۔ کنگالی ماں کے سینے سے لگ کر بولا۔ سنا ماں۔ راج کمار کوتوال کا بیٹا اور وہ پر دار راج گھوڑا۔۔"

ابھاگنی نے راج کمار کوتوال کے بیٹے اور پر دار راج گھوڑے کی کہانی شروع کر دی یہ اس کی بہت دنوں کی سنی ہوئی اور بہت دنوں کی کہی ہوئی کہانیاں تھیں۔ لیکن تھوڑی بعد اس کا راج کمار اور

کوتوال کا بیٹا دونوں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے اس نے وہ کہانی شروع کردی جو دوسروں سے سنی ہوئی نہ تھی خود اسی کی بنائی ہوئی تھی جیسے جیسے اس کا بخار بڑھتا گیا اور سر میں گرم خون کا دورہ زور پکڑتا گیا۔ وہ نئی نئی کہانیوں کا اندر جال بناتی چلی گئی۔ کنگالی خوف تعجب اور اضطراب کے باعث ماں کے گلے سے اس طرح چمٹتا گیا جیسے وہ اس کے سینے میں سما جائے گا

سورج ڈوب چکا تھا اس کے ڈوبتے ہی شام کا اداس دھندلکا آہستہ آہستہ گاڑھا ہو کر چاروں طرف پھیل گیا۔ لیکن آج گھر میں دیا نہیں جلا۔ گرہست کا آخری فرض انجام دینے کے لئے کوئی نہیں اٹھا۔ گہرے اندھیرے میں صرف بیمار ماں کی مسلسل آواز خاموش بیٹے کے کانوں میں شہد برساتی چلی جارہی تھی وہی شمشان اور شمشان کے سفر کی کہانی تھی وہی رتھ وہی نہا در سے رنگے لال لال پاؤں وہی اسکا سورگ کا سفر کس طرح غم زدہ شوہر آخری مرتبہ پاؤں کی خاک دے کر روتا ہوا رخصت ہوا کس طرح ہری ہری کے پکار کے ساتھ بیٹے ماں کی ارتھی اٹھائے گئے اور پھر اس کے بعد اولاد کے ہاتھ سے آگ۔ وہ آگ آگ نہیں تھی بیٹیا۔ وہ ہری کی صورت تھی اور اس کا آسمان کی طرف اڑتا ہوا دھواں۔ دھواں نہیں۔ سورگ کا رتھ تھا بیٹا کنگالی چرن!"

"کیا ہے ماں؟"

"اگر مجھے تیرے ہاتھ کی آگ مل گئی بیٹیا۔ تو برہمنی ماں کی طرح میں بھی سورگ کو جا سکوں گی"

کنگالی نے دھیمی آواز میں صرف اتنا کہا۔ چپ رہ۔ ایسی بات نہیں

کیا کرتے"۔

ماں شائد اس کی بات سن بھی نہ سکی۔ وہ گرم سانس چھوڑتی ہوئی کہنے لگی "کچھ نیچ ذات ہونے کی وجہ سے کوئی نفرت نہ کر سکے گا نہ غریب مصیبت زدہ ہونے کے باعث کوئی روک ٹوک کر سکے گا۔ واہ بیٹے کے ہاتھ کی آگ! ارتھ کو آنا ہی پڑے گا۔

بیٹا ماں کے منہ پر منہ رکھ کر بھرائے ہوئے گلے سے بولا۔ ایسی بات نہ کر ماں مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے"۔

ماں نے کہا اور سن کنگالی! تو اپنے باپ کو پکڑ لانا اور وہ اسی طرح اپنے پاؤں کی دھول میری پیشانی سے لگا کر مجھے رخصت کریں گے اسی طرح پاؤں میں مہاور ماتھے پر سیندور۔ لیکن یہ سب کون کرے گا بیٹا تو کرے گا۔ نہ کنگالی۔ تو ہی تو میرا بیٹا ہے۔ تو ہی بیٹی ہے تو ہی سب کچھ ہے۔

یہ کہہ کر ماں نے بیٹے کو سینے سے چمٹا لیا۔

(۳)

ابھاگنی کی زندگی کے ڈرامے کا آخری سین ختم ہونے والا تھا۔ جو زیادہ طویل نہیں مختصر ہی تھا۔ شائد تیس سال پورے ہوئے ہوں یا ممکن نہ بھی پورے ہوئے ہوں۔ یہ سین ختم بھی ہوا۔ بالکل معمولی طور پر۔ گاؤں میں کوئی وید تھا نہیں۔ دوسرے گاؤں میں ایک وید رہتا تھا۔ کنگالی اس کے پاس جا کر رویا دھویا۔ ہاتھ جوڑے۔ پاؤں پڑا آخر میں ایک لوٹا گرد رکھ کر اسے ایک روپیہ نذر بھی دی۔ پھر بھی وہ نہ آیا۔ اس نے چار پانچ گولیاں دے کر ٹال دیا۔ پھر ان گولیوں

کا دینا بھی جھنجٹ سے خالی نہ تھا۔ کھرل شہد۔ ادرک اور تلسی کے پتوں کا عرق۔ کنگالی کی ماں نے بیٹے پر خفا ہو کر کہا۔ "تو مجھ سے پوچھے بغیر لوٹا کیوں گرو رکھ آیا بیٹا؟"

اس کے بعد اس نے گولیوں کو ہاتھ میں لے کر سر سے لگایا اور انہیں چولہے میں ڈال دیا۔ بولی "اچھا ہونا ہے تو اسی طرح ہو جاؤنگی ورنہ باگدی دولوں کے گھر دوا کھا کر کوئی بھی تندرست نہ ہوا۔

دو روز اسی طرح گذر گئے۔ پاس پڑوس کے لوگ خبر پاکر اسے دیکھنے آئے اور اپنی واقفیت کے مطابق مشٹی یوگ، ہرن کا سینگ، گٹی کوڑی جلا کر شہد کے ساتھ چٹانے وغیرہ کی فضول دوائیں بتا کر اپنے اپنے کام سے چلے گئے۔ کمسن کنگالی گھبرا سا گیا تو ماں نے اسے اپنے پاس کھینچ کر کہا۔ "وید کی دوا سے کچھ نہ ہوا بیٹا۔ تو ان دواؤں سے کیا ہونا ہے میں اسی طرح تندرست ہو جاؤں گی"

کنگالی نے ۔ ۔ ۔ ۔ روتے ہوئے کہا۔ "تو نے گولیاں تو کھائیں نہیں ماں تو نے تو ان کو چولہے میں پھینک دیا۔ بھلا اس طرح کوئی تندرست ہوتا ہے"

"میں اچھی ہو جاؤں گی۔ اب تو تھوڑا سا بھات دال پکا کر کھالے دیکھوں کس طرح پکاتا ہے، میں دیکھتی رہوں گی"

کنگالی کو آج اپنی زندگی میں پہلی بار اپنے ہاتھ سے پکانا پڑا۔ اس لئے نہ وہ اچھی طرح پیچ ہی نکال سکا۔ نہ اسے ٹھیک سے برتن سے کھانا ہی نکالنا آیا۔ اس سے چولہا تک تو اچھی طرح جلا نہیں۔ ابال کھا کر چولہے میں پانی گر جانے سے دھواں ہوا۔ وہ الگ چاول

نکالنے میں چاروں طرف بکھر گیا۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے ایک بار اٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ سر سیدھا نہ کر سکی۔ بچھونے پر گر پڑی۔"

لڑکے کے کھانا کھا چکنے کے بعد اسے اپنے پاس بلا کر یہ سمجھاتے ہوئے کہ کھانا کیسے پکایا اور نکالا جاتا ہے۔ اس کی نحیف آواز یکایک رک گئی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا جاری ہو گئی۔

گاؤں کا ایشور نائی نبض دیکھنا جانتا تھا۔ دوسرے روز آیا۔ اور نبض دیکھ کر اسی کے سامنے چہرہ بھاری بنا کر ایک ٹھنڈی سانس لے کر اور آخر میں سر ہلا کر اٹھا کر ادر چلا گیا کنگالی کی ماں اس کا مطلب سمجھ گئی لیکن وہ ان باتوں سے بالکل ڈری نہیں۔ سب کے چلے جانے پر اس نے لڑکے سے کہا: "ایک بار انہیں بلا لے آسکتا ہے بیٹا؟"

"کس کو ماں؟"

"انہیں کو رے۔ جو اس گاؤں میں چلے گئے ہیں۔"

کنگالی سمجھ گیا۔ بولا: "بابا کو؟"

ابھاگن خاموش تھی۔

کنگالی نے کہا۔ "وہ کیوں آنے لگے ماں؟"

ابھاگن کو خود ہی شک تھا۔ پھر بھی اس نے آہستہ سے کہا: "جا کر کہنا ماں صرف تمہارے پاؤں کی ذرا سی دھول چاہتی ہے۔" وہ اسی وقت جانے کو تیار ہو گیا۔ ماں نے پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: "ذرا رونا دھونا بیٹا۔ کہنا ماں کا آخری وقت ہے۔"

ذرا ٹھیر کر پھر بولی: "ادھر سے لوٹتے ہوئے نائن بھابی سے

سے تھوڑا سا کھا اور پیتے آنا بیٹا۔ وہ میرا نام سنتے ہی دے دے گی۔ وہ مجھے بہت مانتی ہے۔"

اس میں کوئی شک نہیں۔ بہت سی عورتیں اسے مانتی ہیں۔ جب سے کنگالی کی ماں کو بخار آیا ہے۔ اس نے ماں کے منہ سے ان سب چیزوں کا اتنی بار تذکرہ سنا ہے کہ وہ گھر سے چلا تو کانپتا ہوا۔"

(۴)

دوسرے روز رسک دولے فرصت پا کر آیا تو ابھاگن کو اچھی طرح ہوش نہیں تھا۔ چہرے پر موت کے آثار طاری ہو چکے تھے بینائی اس دنیا کا کام ختم کر کے نہ جانے کہاں اور کس انجان دیس کو چلی گئی تھی۔ کنگالی نے روتے ہوئے کہا۔ "ماں! بابا آئے ہیں۔ پاؤں کی دھول لیگی نہ

ماں شائد سمجھ گئی ہو یا نہ سمجھی ہو یا ہو سکتا ہے اس کی گہرائی میں چھپی ہوئی آرزو نے زمانے کی طرح اس کی پوشیدہ حس پر ضرب لگائی ہو۔ موت کی راہ کی اس راہ گیر نے اپنا کمزور کانپتا ہوا ہاتھ اوڑھنے کے باہر نکال کر پھیلا دیا۔ رسک آگے بڑھا۔ اس نے اپنی زندگی میں جس عورت سے کبھی محبت نہیں کی۔ کبھی اسے تسکین و تسلی نہیں دی۔ کبھی اس کی خبر گیری نہیں کی۔ اسے مرتے وقت محض اپنے پاؤں کی ذرا سی دھول دیتے ہوئے رو پڑا۔

راکھال کی ماں نے کہا۔ "ایسی ستی بچھی عورت نہ جانے کیوں برہمن کائستھ کے گھر میں پیدا نہ ہو کر دولوں کے خاندان میں پیدا ہوئی۔ اب اس کی ذرا حالت سنوار دو بیٹا۔ کنگالی کے ہاتھ کی آگ کے لالچ میں بے چاری نے زندگی دے دی۔"

ابھاگنی کے ابھاگ کے دیوتا نے نہ جانے اندیکھے میں کیا سوچا۔ لیکن ماں کی بات کمسن کنگالی کے سینے میں، تیر کی طرح چبھ گئی۔!"

وہ دن تو کسی طرح گذر گیا۔ رات بھی کٹ گئی۔ لیکن کنگالی کی ماں صبح کا انتظار نہ کر سکی نہ جانے اتنی نیچی ذات والوں کے لئے سورگ کے رتھ کا انتظام ہے یا نہیں۔ اندھیرے میں پیدل ہی گھر سے روانہ ہونا پڑتا ہے لیکن اتنا تو واقعہ تھا کہ وہ رات ختم ہونے سے پہلے ہی اس دنیا سے کوچ کر گئی۔"

جھونپڑے کے سامنے آنگن میں بیل کا ایک درخت تھا۔ کہیں سے کلہاڑی مانگ کر رسک نے اس پر چلائی یا نہیں۔ لیکن نہ جانے کہاں سے زمیندار کے پیادے نے آکر اس کے منہ پر تڑاق سے ایک طمانچہ رسید کر دیا اور کلہاڑی چھین کر کہا "سالے کہیں کے یہ تیرے باپ کا درخت ہے جو کاٹ رہا ہے؟

رسک گال سہلانے لگا۔

کنگالی گلوگیر ہو کر بولا۔ واہ۔ یہ تو میری ماں کے ہاتھ کا لگایا ہوا پیڑ ہے۔ پیادے جی۔ تم نے بابا کو ناحق مار دیا۔

پیادے نے اسے بھی گالی دے کر مارنا چاہا۔ لیکن وہ اپنی مری ہوئی ماں کے پاس بیٹھا تھا۔ اس لئے پیادے نے چھوت کے ڈر سے اسے نہیں مارا۔ شور و غل سن کر لوگ جمع ہو گئے۔ کسی نے بھی اس بات سے انکار نہ کیا۔ کہ پوچھے بغیر رسک کا درخت کاٹنا نامناسب تھا۔ سب پیادے کے پاؤں پڑنے اور ہاتھ جوڑنے لگے کہ وہ مہربانی کر کے درخت کاٹنے کا حکم دے دے۔ وجہ یہ تھی کہ بیماری میں جو

بھی کنگالی کی ماں کو دیکھنے آیا تھا۔ اس سے اس نے اپنی آخری تمنا ظاہر کی تھی۔

لیکن پیادہ کسی کی بات سننے والا نہ تھا۔ اس نے ہاتھ اور چہرے کو حرکت دیتے ہوئے کہا "میں ایسی باتیں سننے والا نہیں۔"

زمیندار اس گاؤں میں رہتے نہ تھے۔ یہاں ان کی ایک چھاؤنی تھی۔ اُدھر رائے یہاں کے کارندے تھے۔ لوگ یہاں پیادے سے جس وقت بے فائدہ منت و سماجت کر رہے تھے۔ کنگالی بھاگا ہوا چھاؤنی میں جا پہنچا۔ اس نے لوگوں سے سنا تھا کہ پیادے رشوت لیتے ہیں۔ اس لئے اسے یقین تھا کہ اتنے بڑے ظلم کی بات اگر وہ مالک کے کان تک پہنچا دے گا تو اس کا کوئی نہ کوئی تدارک ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ لیکن ہائے رے ناتجربہ کاری۔ کنگالی۔ بنگال کے زمینداروں اور ان کے کارندوں کو نہ جانتا تھا۔ ابھی ابھی ماں کی گود سے بچھڑا ہوا غم زدہ بچّہ جوش و ہیجان سے بھرا ہوا چھاؤنی پر چلا گیا۔ ادھر رائے ابھی ابھی پوجا پاٹ اور ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے۔ تعجب اور غصّے سے بیتاب ہو کر بولے۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں کنگالی۔ پیادے جی نے میرے باپ کو مارا ہے۔"

"اچھا کیا۔ حرامزادے نے لگان نہ دی ہو گی۔"

کنگالی نے کہا "نہیں بابو صاحب! میرے باپ پیڑ کاٹ رہے تھے۔ میری ماں مر گئی ہے۔ وہ اپنے کو سنبھال نہ سکا اور بے اختیار رو پڑا۔

صبح ہی صبح اس طرح کے رونے دھونے پر اُدھر کو بہت غصہ

آیا۔ چھوکرا مُردے کو چھوکر آیا ہے نہ جانے۔ یہاں بھی کن کن چیزوں کو چھویا چھایا ہوگا۔ کڑک کر بولے "ماں مری ہے۔ تو ہٹ یہاں سے نیچے جا کھڑا ہو۔ ارے کون ہے رے۔

یہاں ذرا گوبر پانی ڈال دے۔ کس ذات کا لڑکا ہے تو؟"

کنگالی نے ڈر کے مارے نیچے اتر کر کہا "ہم لوگ دو لے ہیں"

اُدھر نے کہا "دولے! ارے دولے کے مُردے کے لئے لکڑی کی کیا ضرورت ہے رے؟"

کنگالی نے کہا "اماں مجھے آگ دینے کے لئے جو کہہ گئی ہیں تم جس سے چاہو پوچھ لو بابو صاحب، اماں سب سے کہہ گئی ہیں اور سب اس بات کو جانتے ہیں" ماں کی بات کہتے ہوئے اس کی بار بار منت سماجت ایک ساتھ یاد آجانے کے باعث کنگالی کو ایسا معلوم ہوا۔ فرطِ گریہ سے اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔

ادھر رائے نے کہا۔ اماں کو جلانا چاہتا ہے تو پیڑ کے دام پانچ روپے لے آ۔ بول۔ لائے گا؟"

کنگالی جانتا تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا تھا۔ کفن خریدنے کے لئے روپے کی ضرورت تھی۔ اس لئے بندو کی بوٗا اس کے بھات کھانے کی تھالی گرد رکھنے کے لئے لے گئی تھی اس نے سر ہلا کر کہا "نہیں"

ادھر نے برافروختہ ہو کر کہا "نہیں تو جا ماں کو لے جا کر ندی کے تاڑوں میں گاڑ دے۔ کسی کے پیڑ پر تیرا باپ کلہاڑی چلانے والا کون ہوتا ہے۔ پاجی۔ کم بخت۔ بد معاش کہیں کا"

کنگالی نے کہا" وہ تو ہم لوگوں کے آنگن کا پیڑ ہے بابو صاحب! اسے میری ماں نے اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔"

اپنے ہاتھ سے لگایا تھا؟ پانڈے، اس سوّر کی گردن میں ہاتھ دے کر بھگا دے یہاں سے۔"

پانڈے نے آ کر دھکا دیتے ہوئے منہ سے ایسی بات کہی جسے صرف زمیندار کے کارندے ہی کہہ سکتے ہیں۔

کنگالی دھول جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چھاؤنی سے باہر چلا گیا۔ اسے کیوں مارا گیا اور اس کی کیا خطا تھی۔ کنگالی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

کارندے کے دل پر ان باتوں کا مطلق اثر نہ ہوا اگر وہ ایسا ہوتا۔ تو اسے . . . . یہ نوکری ہی نہ ملتی۔ لڑکے سے ہمدردی کرنے کے بجائے اس نے حکم دیا۔" پارس! ذرا دیکھنا تو اس کا لگان باقی ہے یا نہیں۔ باقی ہو تو جال ڈال کوئی چھین کر رکھ لینا حرامزادے کا کچھ ٹھیک نہیں کہ کب گاؤں چھوڑ کر بھاگ جائے۔"

مکرجی کے گھر شرادھ تھا۔ درمیان میں ایک روز باقی تھا۔ مالکن کی حیثیت کے مطابق بڑے زور شور سے شرادھ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بوڑھے ٹھاکر داس خود تمام کاموں کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ کنگالی ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بولا" پنڈت جی میری ماں مر گئی ہے۔"

مکرجی" تو کون ہے۔ کیا چاہتا ہے؟"

میرا نام کنگالی ہے۔ ماں آگ دینے کیلئے کہہ گئی ہے۔"

"تو جا کر دے"۔

اس درمیان میں چھاؤنی کا موا قعہ چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ ایک آدمی نے کہا "یہ لڑکا شائید ایک پیڑ چاہتا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے واقعہ سنایا"۔

مکرجی حیرت اور خفگی کے ساتھ بولے "اس کی سنو۔ ہمیں خود کتنی لکڑی کی ضرورت ہے۔ کل ہی پرسوں تو کام ہے۔ جا جا یہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اتنا کہہ کر وہ دوسری طرف چلے گئے۔

بھٹاچاریہ جی پاس ہی بیٹھے فرو تیار کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا "تیری ذات میں جلاتے کب ہیں رے جا منہ میں ذرا سا آگ دے کر ندی کے تاڑوں میں گاڑ دے"۔

مکرجی کا بیٹا کام میں مصروف جلدی میں ادھر سے کہیں جا رہا تھا۔ اس نے کان کھڑے کر کے ذرا سنا اور کہا "دیکھتے ہیں۔ پنڈت جی۔ سب سارے آج کل برہمن کائستھ ہو جانا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کام سے چلا گیا۔

کنگالی نے پھر کسی سے درخواست نہیں کی۔ ان دو ہی گھنٹوں کے تجربے نے گویا دنیا میں اسے بالکل بوڑھا بنا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ وہاں سے ماں کے پاس چلا آیا۔

اس نے ندی کے تاڑوں میں گڑھا کھود کر ماں کو اس میں سلا دیا۔ راکھال کی ماں نے کنگالی کے ہاتھ میں تھوڑا سا جلتا ہوا پوال دیکر اس کی ماں کے منہ سے لگوا دیا۔ اس کے بعد سب نے کنگالی کی ماں کو مٹی سے ڈھک کر اس کا آخری نشان تک مٹا دیا۔

تمام لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔ صرف کنگالی اس جلے ہوئے پوال سے جو تھوڑا بہت دھواں چکر کھاتا آسمان کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ ٹکٹکی باندھے ہوئے کھویا ہوا سا اسے دیکھتا رہا۔"

(راجا آرٹ پریس امرتسر میں باہتمام راجا پرنٹر چھپا۔)

نور الحق خوشنویس

